# فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۷۹

جنوری ۱۹۵۷ء تا جون ۱۹۵۷ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

| شمار | اسمائے گرامی | صفحہ | شمار | اسمائے گرامی | صفحہ |
|---|---|---|---|---|---|
| ۱ | مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ | ۲۳۱، ۳۰۵ | ۶ | جناب مولانا عبد الکلیم صاحب چشتی فاضل دیوبند | ۳۲۵-۳۴۳ |
| ۲ | جناب شبیر احمد خاں غوری ایم اے ایل ایل بی، بی ٹی، اے ایچ | ۲۹۳، ۳۴۳، ۳۶۲، ۳۶۶، ۴۲۳ | ۷ | جناب عطاء الرحمٰن صاحب عطا کاکوی پرفیسر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پٹنہ | ۱۴۲ |
| ۳ | سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ایم اے علیگ، | ۱۶۵، ۲۲۵ | ۸ | جناب حافظ غلام مرتضیٰ صاحب ایم اے لکچرار عربی و فارسی الٰہ آباد یونیورسٹی | ۲۰۶ |
| ۴ | جناب مرزا صفدر علی ایم اے لکچرار ورنگل کالج، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن | ۴۵۹ | ۹ | جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب ایم اے ایل ایل بی، پی ایچ ڈی صدر شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی، | ۱۱۳ |
| ۵ | جناب مولوی ضیاء احمد صاحب بدایونی ایم اے ریڈر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی | ۱۰۰ | ۱۰ | جناب شیخ فرید صاحب لکچرار آرٹس کالج جبل پور | ۱۳۱ |

## شعراء



---



# فہرست مضامین معارف

جلد ۷۹

جنوری ۱۹۵۷ء تا جون ۱۹۵۷ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۷۹ ماہ جمادی الثانی ۱۳۷۶ھ مطابق جنوری ۱۹۵۷ء نمبر ۱

## مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# شذرات

ہندوستان اور پاکستان میں ایک دوسرے کی کتابوں کی طباعت و اشاعت کے بارہ میں مؤثر پابندی نہ ہونے سے دونوں ملکوں کے مصنفین اور تصنیفی و اشاعتی اداروں کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے، جس ملک کے تاجر کا دل چاہتا ہے دوسرے ملک کی کتابیں چھاپ لیتا ہے اور انکے مالک کچھ نہیں کر سکتے، چنانچہ اب سے چند سال پہلے لاہور کے ایک تاجر نے دار المصنفین کی سیرۃ النبی کا پہلا حصہ چھاپ لیا تھا، مگر پنجاب کے باحمیت اخبارات نے اسکو ایسا آڑے ہاتھوں لیا اور بعض اعلیٰ حکام نے بھی دباؤ ڈالا کہ سیرت کے مطبوعہ نسخے تو دار المصنفین کو مل گئے لیکن اسکی طباعت کے مصارف اسکو ادا کرنے پڑے اور ان نسخوں کو پاکستان ہی میں خسارہ سے فروخت کرنا پڑا جس سے اسکو مالی نقصان پہنچا، اب لاہور کے مکتبہ مصطفائی نے یہی حرکت کی ہے، اور سیرت کا پہلا حصہ چھاپ لیا ہے، یہ بدیانت مکتبہ مولانا ابو الکلام کا تذکرہ بھی چھاپ چکا ہے،

---

ہندوستان کی تقسیم کے بعد سے یہاں کے اسلامی ادارے جن مالی مشکلات میں مبتلا ہیں اور جسطرح انکی زندگی بسر ہو رہی ہے اس سے پاکستان کے لوگ خوب واقف ہیں، ایسی حالت میں اگر وہ انکی مدد نہیں کر سکتے تھے تو انکا کم سے کم یہ فرض تو تھا کہ وہ انکو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرتے، لیکن وہاں کے خود غرض تاجروں کو اسمیں بھی باک نہیں اور تھوڑے فائدے کیلیے انکی کتابیں چھاپ لیتے ہیں، ہم کو توقع ہے کہ پاکستان خصوصاً لاہور کے اخبارات نے جسطرح پہلے اپنی اسلامی حمیت کا ثبوت دیا تھا، اس مرتبہ بھی دینگے اور اس بدیانت ادارہ کو ایسا سبق دینگے کہ پھر کسی کو ایسی جرأت نہ ہو، اور اسکو سیرت کے مطبوعہ نسخے واپس کرنے پر مجبور کریں گے، ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو کہ سیرت نبوی کا پہلا حصہ جو علامہ شبلی کی تصنیف ہے، دار المصنفین کی ملکیت نہیں ہے، اسلیے اسکے چھاپنے میں کوئی مضائقہ نہیں، تو یہ غلط فہمی دور ہو جانا چاہیے، اولاً علامہ شبلی



کی تمام تصانیف خواہ وہ قانونی حیثیت سے دار المصنفین کی ملک ہوں لیکن اخلاقی حیثیت سے وہی انکا وارث ہے اور سیرۃ النبی کا پہلا حصہ تو علامہ شبلی کی وفات کے بعد دار المصنفین نے شائع کیا تھا اور وہ اسی کے نام رجسٹرڈ ہے، اسلیے وہ قانونی حیثیت سے بھی اسی کی ملک ہے، اور اسکی اشاعت کا کسی کو حق نہیں ہے

---

دار المصنفین کی آمدنی کا بڑا ذریعہ کتابوں کی تجارت ہے، اسکے علاوہ پاکستان کے قیام سے پہلے اسکو حیدرآباد اور بھوپال کی ریاستوں سے بھی مدد ملتی تھی، مگر وہ عرصہ ہوا بند ہو گئی، اب اس کی آمدنی کا ذریعہ صرف تجارت رہ گیا ہے، اسکی کتابوں کی زیادہ مانگ پاکستان میں ہے، مگر دونوں ملکوں کے درمیان مالی لین دین کی دشواریوں کیوجہ سے متفرق خریدار کتابیں منگا نہیں سکتے، اور پرمٹ سسٹم کیوجہ سے وہاں کے تاجروں کو بھی پہلے کے مقابلہ میں بہت محدود تعداد میں کتابیں منگانے کی اجازت ملتی ہے، جس سے دار المصنفین کی آمدنی بہت گھٹ گئی ہے اور کئی سال سے وہ سخت مالی مشکلات میں مبتلا ہے، اگر حکومت ہند نے ساٹھ ہزار کی وقتی مدد نہ کر دی ہوتی تو اسکا چلنا دشوار ہو جاتا، اب اگر پاکستان کے تاجر اسکا رہا سہا ذریعہ آمدنی بھی چھین لینا چاہتے ہیں تو اسکی زندگی کی کیا صورت ہوگی، کیا پاکستان چاہتا ہے کہ ہندوستان میں جو اسلامی ادارے باحال تباہ باقی رہ گئے ہیں وہ بالکل ہی ختم ہو جائیں، اگر ایسا نہیں ہے تو اسکو اسکا تدارک کرنا چاہیے، اور یہ تنہا دار المصنفین یا اسلامی اداروں کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کے مصنفین اور ادارے اس مصیبت میں مبتلا ہیں، اسلیے دونوں حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ کوئی ایسا قانون بنائیں جس سے ایک ملک کی کتابیں دوسرے میں نہ چھپ سکیں، ہمکو توقع ہے کہ پاکستان کی حکومت اور اخبارات دونوں ہماری اس درخواست پر توجہ کرینگے، جن اخبارات نے خود دار المصنفین کی ہمدردی میں پیش قدمی کی ہے، ادارہ ان سب کا شکرگذار ہے،

---

ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ایک ایسا ادارہ تھا جس کا مقصد اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی خدمت اور ترقی تھا، گو اب ملک کے حالات اور حکومت کی پالیسی کے اثر سے اسکے کاموں کی نوعیت بدل گئی تھی اور اردو کا کام بہت کم ہو گیا تھا، پھر بھی کچھ نہ کچھ ہوتا تھا، مگر ہمارے صوبہ کی حکومت کو یہ بھی گوارا نہیں، چنانچہ وہ اکیڈمی کے دستور

کی بعض دفعات میں ترمیم کرانا چاہتی ہے، ان میں دو ترمیموں کا اثر اردو پر خاص طور سے پڑیگا، ایک یہ کہ اکیڈمی کا نام ہندوستانی اکیڈمی کے بجائے اترپردیشیہ اکیڈمی کر دیا جائے، دوسرے اسکا مقصد ہندی اور اردو کے بجائے سرکاری زبان ہندی اور ان زبانوں کی خدمت قرار دیا جائے جو ہندی سے متوسل ہیں۔ (اصل انگریزی لفظ Dependent ہے)، اگرچہ کہنے کیلیے یہ کہا جائیگا کہ ہندی کے متوسلین میں اردو بھی شامل ہے لیکن اس تبدیلی کا جو اصل مقصد و منشا ہے اسکو ہر شخص سمجھ سکتا ہے، یہ بلاشبہ صحیح ہے کہ اردو ہندی ہی سے نکلی ہے، لیکن اسکی حیثیت ایک مستقل زبان کی ہے جو ہندی سے زیادہ ترقی یافتہ ہے، اس لیے ہندی سے پیدا شدہ دوسری بولیوں کی طرح اس کو ہندی کا ضمیمہ بنانا صحیح نہیں ہے، اسی طرح ہندستانی کے لفظ سے اردو کی بو آتی تھی، اس لیے اس کا بدلنا بھی ضروری تھا،

اکیڈمی کو صوبہ کی حکومت سے امداد ملتی ہے اور اس کا دارومدار بڑی حد تک اسی امداد پر ہے، اسلیے وہ ان تجویزوں کے ماننے پر مجبور ہے لیکن اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو بھی آجکل اردو کے بارہ میں جو ذہنیت ہو رہی ہے اس میں اس قسم کی تجویز عین جذبات کے مطابق تھی، اردو کے ممبروں کی تعداد ہی کتنی ہے پھر انکی آواز ہی کیا، اسلیے یہ تجویزیں گذشتہ ۱۲ دسمبر کے جلسہ میں منظور ہو گئیں، اس طرح اکیڈمی میں اردو کا جو نام باقی تھا وہ بھی مٹ گیا، آیندہ ۲ جنوری کو پھر اسکی مخصوص میٹنگ ہو رہی ہے، دیکھیں اس میں کیا فیصلہ ہوتا ہے۔

رسالہ صبح صادق اس سے پہلے قرآن نمبر نکال چکا ہے، اب اس نے حدیث نمبر نکالا ہے، اسمیں احادیث نبوی ؐ کے مختلف پہلوؤں پر مشاہیر اہل علم و قلم کے مفید مضامین جمع کر دیے گئے ہیں، جن سے احادیث نبوی کی دینی حیثیت اور کتب احادیث خصوصاً صحاح ستہ کی اہمیت ظاہر ہو جاتی ہے اور حدیث کے متعلق اسکے منکرین کی پھیلائی ہوئی بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں، مگر ایک نمبر میں منکرین حدیث کے جواب کے سلسلہ کے تمام مضامین کا جمع کرنا ممکن نہ تھا، اسلیے بعض اہم مضامین چھوٹ گئے ہیں، اگر صبح صادق اس نمبر کا ایک ضمیمہ نکال کر ان مضامین کو بھی شائع کرے تو ایک مزید خدمت ہوگی، مگر یہ نمبر بھی بہت مفید ہے اور جن لوگوں کو حدیث نبوی سے ذوق ہے یا انکو اسکے متعلق کچھ شکوک و شبہات ہیں ان کو اس نمبر کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے، دفتر صبح صادق بکارم نگر لکھنؤ سے ملے گا،

---



# مقالات

## مولانا عبد السلام ندوی

از شاہ معین الدین احمد ندوی

دار العلوم ندوۃ العلماء نے اپنے دور کمال میں جو نامور فرزند پیدا کیے ان میں ایک مولانا عبد السلام ندوی بھی تھے، وہ اعظم گڈھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں علاء الدین پٹی میں سنہ ۱۳۰۰ھ میں پیدا ہوئے، ان کے والد متوسط درجہ کے زمیندار تھے، مگر کاشتکاری بڑے پیمانہ پر کرتے تھے، نیل کی تجارت بھی تھی، اسلیے ان کا شمار گاؤں کے خوش حال لوگوں میں تھا، مولانا عبد السلام کی تعلیم گھر کے مکتب میں ہوئی، فارسی کی ابتدائی کتابیں مکتب ہی میں ایک معلم سید امداد علی سے پڑھیں اور اسکی تکمیل اپنے خسر مولوی عبد اللہ صاحب[1] سے کی، فارسی کی تکمیل کے بعد عربی کی تعلیم کیلیے کانپور گئے اور اسکی ابتدائی تعلیم کانپور اور اسکے بعد آگرہ کی جامع مسجد کے مدرسہ میں حاصل کی، اس زمانہ میں مشرقی اضلاع میں مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور کا بڑا شہرہ تھا، یہاں مولانا کے ایک عزیز مولانا شبلی[2] مدرس تھے، اسلیے وہ آگرہ سے غازیپور چلے آئے، اور متوسطات تک کی تعلیم چشمۂ رحمت میں پائی، پھر سنہ ۱۹۰۶ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے اور سنہ ۱۹۱۰ء میں یہاں سے فراغت حاصل کی اور یہیں ادب کے مدرس مقرر ہو گئے۔

ان میں شعر و ادب اور لکھنے پڑھنے کا ذوق ابتدا سے تھا، چنانچہ مولانا شبلی کی جوہر شناس نگاہ نے

---

[2] ان مولانا شبلی کا وطن جیراجپور ضلع اعظم گڈھ تھا، یہ بھی دار العلوم ندوۃ العلماء میں مدرس ہو گئے تھے، اور اسکے فقیہ اول اور مفتی تھے، راقم الحروف نے بھی ان سے ہدایہ پڑھی ہے، ابھی چند سال ہوئے کہ ان کا انتقال ہوا، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

اسی زمانہ میں ان کی صلاحیتوں کا اندازہ کرلیا تھا، اور جن لوگوں کو انھوں نے تالیف و تصنیف
کی تربیت دی تھی، ان میں ایک مولانا عبدالسلام بھی تھے، اور ان کے بارہ میں یہ پیشین گوئی کی تھی
کہ آگے چل کر وہ ایک اچھے مصنف ہوں گے، یہ پیشین گوئی بالکل صحیح ثابت ہوئی، انھوں نے
پہلا مضمون ندوہ میں داخلہ کے بعد ہی ۱۹۰۶ء میں تناسخ پر لکھا تھا، مولانا شبلی کو یہ مضمون اسقدر
پسند آیا کہ اس کو اصلاح بغیر اپنے نوٹ کے ساتھ الندوہ میں شائع کیا، اور مولانا کو پانچ روپے انعام
دیے، اسی مضمون سے مولانا کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز ہوا، اور اس کے بعد برابر ان کے مضامین
الندوہ میں نکلتے رہے، اور وہ پہلے اس کے سب اڈیٹر پھر اڈیٹر مقرر ہوئے، اس کے بعد جب مولانا
شبلی نے سیرۃ النبیؐ کی تالیف کا کام شروع کیا تو مولانا عبدالسلام کو اپنا لٹریری اسسٹنٹ بنایا، اسی زمانہ
میں مولانا ابوالکلام بھی مولانا شبلی کے زیر تربیت تھے، وہ بھی الندوہ کے اڈیٹر رہ چکے تھے اور ان کا
اور مولانا عبدالسلام کا ساتھ رہ چکا تھا، چنانچہ ۱۹۱۲ء میں جب انھوں نے کلکتہ سے اپنا مشہور اخبار
الہلال نکالا تو مولانا عبدالسلام صاحب کو بھی بلالیا اور وہ ڈیڑھ دو سال تک الہلال میں کام کرتے
رہے، ۱۹۱۴ء میں الہلال کو بنگال گورنمنٹ نے بند کردیا، اسی سنہ میں ۱۸ نومبر کو مولانا شبلی
کا بھی انتقال ہوگیا،

مولانا شبلی کے پیش نظر جو مذہبی اور علمی کام تھے اور جن کو وہ اپنی زندگی میں پورا نہ کرسکے تھے،
ان کی تکمیل کے لیے دارالمصنفین کا خاکہ بنا کر اپنے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی کو ان کی تکمیل
کی وصیت کرگئے تھے، چنانچہ مولانا شبلی کی وفات کے بعد ہی دسمبر ۱۹۱۴ء میں جب انھوں نے دارالمصنفین
قائم کیا، تو مولانا عبدالسلام صاحب کو کلکتہ سے اعظم گڈھ بلالیا، اس وقت سے لیکر وفات
تک وہ برابر دارالمصنفین سے وابستہ رہے اور مرکر اس سے جدا ہوئے۔

مولانا شبلی کی طرح مولانا سید سلیمان ندوی کی شخصیت بھی بڑی جامع و ہمہ گیر تھی، انھوں نے



نہ صرف مولانا شبلی کے ناتمام کاموں کو پورا کیا بلکہ حالات و ضروریات کے مطابق دارالمصنفین کے کاموں
کا دائرہ اتنا وسیع کردیا کہ وہ مولانا شبلی کے تخیل سے بہت آگے بڑھ گیا، اور اس کی شہرت عالمگیر ہوگئی،
دارالمصنفین کے کاموں میں مولانا عبدالسلام صاحب ندوی، مولانا سید سلیمان ندوی کے دست
راست تھے، مگر

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

مولانا سید سلیمان ندوی کی شخصیت بڑی جامع تھی، ان کے افکار و خیالات نہایت بلند اور ان کے
کاموں کا دائرہ بڑا وسیع تھا، اور مولانا عبدالسلام صاحب طبعاً نہایت خاموش، گوشہ نشین، قانع
اور شہرت و نام و نمود سے بالکل بے نیاز تھے، ان میں ایجاد و اختراع، حوصلہ مندی اور قیادت کا
مادہ مطلق نہ تھا، لیکن تصنیفی قابلیت اور زور قلم میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے، اس لیے انھوں نے
اپنا دائرۂ عمل "تالیف و تصنیف ہی تک محدود رکھا، اور نہایت خاموشی کے ساتھ عمر بھر اس کام کو
انجام دیتے رہے، اور اس میں وہ دارالمصنفین کے رکن اعظم تھے جس پر ان کے مضامین اور تصانیف
شاہد ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی کی بعض اہم کتابوں مثلاً سیرۃ النبیؐ اور حیات شبلی کی تالیف میں انکا
بھی حصہ ہے جس کی تصریح ان کتابوں کے مقدمہ میں موجود ہے،

ادب و انشاء میں وہ نہایت ممتاز تھے، اور علامہ شبلی کی یہ وراثت ان کے حصہ میں زیادہ آئی
تھی، چمنستان ادب میں ان کا قلم بڑا سبک خرام تھا، ذہن بڑا اخاذ پایا تھا، سرسری مطالعہ سے کتابوں
کا جوہر کھینچ لیتے تھے، اور عربی کی ہر اہم اور نئی کتاب سے وہ اپنے کام کی کچھ نہ کچھ باتیں ضرور نکال لیتے
تھے اور اس پر ایک مضمون تیار کردیتے تھے، چنانچہ ان کے بیشتر مضامین کسی نہ کسی کتاب کے مطالعہ کا نتیجہ
ہیں، بلکہ کبھی کبھی وہ ان سے مستقل تصنیف کا خاکہ تیار کرلیتے تھے، چنانچہ سیرۃ عمر بن
عبدالعزیز کی تالیف میں انھوں نے اگرچہ بہت سی کتابوں سے مدد لی ہے، لیکن اس کا ابتدائی

خاکہ سیرۃ العمرین ابن جوزی سے ان کے ذہن میں آیا تھا، اسی میں رنگ بھر کر عمر بن عبد العزیزؒ کی سیرت کا مرقع تیار کیا، اسی طریقہ پر ان کا ایک رسالہ القضا فی الاسلام ابن جوزی کی الطرق الحکمیہ سے ماخوذ ہے، ان کو فطری لگاؤ شعروادب سے تھا لیکن مذہبیات سے لیکر شعروادب تک ہر موضوع پر لکھنے کی یکساں قدرت تھی، چنانچہ ان کے مضامین میں جس قدر تنوع ہے، وہ مشکل سے کسی دوسرے اہل قلم کے مضامین میں نکل سکتا ہے، ایک زمانہ میں معارف کا کوئی نمبر مشکل ہی سے ان کے مضمون سے خالی ہوتا تھا، اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو کئی جلدوں میں آئیں گے اور تنوع و رنگارنگی کا نہایت دلکش نمونہ نظر آئے گا، لیکن طبیعت شاعرانہ اور تخیل پرست تھی، اسیلے محنت و مشقت سے گھبراتے اور لکھنے کیلیے ایسے ہلکے پھلکے موضوع کا انتخاب کرتے تھے جس میں زیادہ کدوکاوش کی ضرورت نہ ہو، مگر اس کمی کو وہ ادبی حسن و لطافت سے پورا کردیتے تھے، قلم اتنا پختہ اور منجھا ہوا تھا کہ قلم برداشتہ لکھتے تھے، اور لکھنے کے بعد مسودہ پر نظر ثانی اور حک و اصلاح کی ضرورت بہت کم پیش آتی تھی،

محنت کے زیادہ عادی نہ تھے، صرف دن میں تین چار گھنٹے کام کرتے تھے، مگر اس معمول میں فرق نہ آتا تھا، اور اس انہماک سے لکھتے کہ کوئی ہنگامہ اور شور وغل ان کے کام میں خلل انداز نہ ہو سکتا تھا، اس پابندی کا یہ نتیجہ ہے کہ سہولت پسندی کے باوجود ان کے کام کی مقدار سب سے زیادہ ہوتی تھی، انھوں نے مختلف موضوعوں پر سیکڑوں مضامین اور ہزاروں صفحات لکھے، ان کی مستقل تصانیف کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے، اہم تصانیف حسب ذیل ہیں:

**اسوۂ صحابہؓ**، دو جلد۔ مسلمانوں کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابۂ کرام کی زندگی اسوۂ عمل ہے، اس لیے دارالمصنفین میں سیرۃ النبی کے ساتھ ہی سیر الصحابہ کی تالیف کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا تھا، جو ۱۲ جلدوں میں ہے، اس کے مختلف حصے مختلف رفقاء نے لکھے ہیں، ان میں اسوۂ صحابہ دو جلدوں میں اور اسوۂ صحابیات مولانا عبد السلام صاحب کی تالیف ہیں پہلی جلد میں



عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق و معاشرت وغیرہ کے متعلق صحابۂ کرام کے موثر و سبق آموز واقعات اور دوسری جلد میں ان کے مذہبی، سیاسی اور علمی کارناموں کو اس انداز سے تحریر کیا گیا ہے جس سے زندگی کے ہر شعبہ میں اسلامی تعلیمات کا عملی مرقع سامنے آجاتا ہے، اور مسلمانوں کو زندگی کے مختلف پہلوؤں میں ہدایت و رہنمائی حاصل ہوتی ہے،

**سیر الصحابیات**۔ اسلام نے نہ صرف مردوں بلکہ عورتوں میں بھی عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا تھا، اور جس طرح مسلمان مردوں کے لیے صحابۂ کرام کی زندگی اسوۂ حسنہ ہے اسی طرح مسلمان عورتوں کے لیے صحابیات کی زندگی نمونہ ہے، اس لیے سیر الصحابیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات، بنات طاہرات اور عام صحابیات کے اخلاق و معاشرت وغیرہ کے متعلق موثر واقعات جمع کیے گئے ہیں، جو مسلمان خواتین کے لیے شمع ہدایت کا کام دیتے ہیں،

**سیرۃ عمر بن عبد العزیزؒ**۔ خلفاء راشدین کے بعد اسلامی خلافت نے دنیاوی بادشاہت کی شکل اختیار کر لی تھی، اور اس میں وہ تمام خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں جو دنیاوی بادشاہتوں کا خاصہ ہیں، جب عنان حکومت حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے ہاتھوں میں آئی تو انھوں نے ہر طرح کے خطرات برداشت کر کے بڑی جرأت و دلیری سے اس حکومت کو خلافت کے قالب میں بدل کر ایک مرتبہ پھر صدیقی اور فاروقی عہد کی یاد تازہ کر دی، عمر بن عبد العزیزؒ نے تخت شاہی پر بیٹھکر جیسی فقیرانہ زندگی بسر اور جیسی عادلانہ حکومت کی اس کی مثال خلافت راشدہ کے علاوہ اور کسی دور میں نہیں مل سکتی، اور اس حیثیت سے ان کی زندگی نہ صرف مسلمان بادشاہوں بلکہ تمام دنیا کے فرمانرواؤں کیلیے نمونہ ہے، سیرۃ عمر بن عبد العزیزؒ میں اس موثر طریقہ سے ان واقعات کی تفصیل تحریر کی گئی ہے، جس سے مسلمانوں کے ایمان میں تازگی اور غیر مسلموں کے دلوں میں اسلام کی عظمت کا نقش قائم ہوتا ہے۔

**تاریخ اخلاق اسلامی**۔ دوسری قوموں کے اخلاق کی تعمیر و تشکیل اور اس کے تغیرات میں مختلف عوامل و اسباب کو بڑا دخل ہوتا ہے، لیکن مسلمانوں کا ضابطۂ اخلاق کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہے، جس میں کوئی بنیادی تغیر نہیں ہو سکتا، مگر طبعی اسباب کی بنا پر مسلمانوں کے مختلف طبقوں کے اخلاق میں بھی تغیر ہوتے رہے ہیں، مولانا لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ کے طرز پر مسلمانوں کے اخلاق کی تاریخ لکھنا چاہتے تھے، مگر اس کی ایک ہی جلد مرتب کر سکے، اس میں پہلے بعثت نبوی کے قبل عربوں کے اخلاق کی تصویر دکھائی گئی ہے، پھر اسلام نے اس میں جو انقلاب پیدا کیا اور عہد نبوت میں جس طرح اسلامی اخلاق کی تعمیر و تشکیل عمل میں آئی اس کی تفصیل ہے،

**امام رازی**۔ مسلمان فلاسفہ اور متکلمین میں امام فخرالدین رازی کا درجہ نہایت ممتاز ہے، دینی علوم میں بھی ان کو امامت کا درجہ حاصل تھا اور وہ اپنے دور کے نامور فلسفی اور متکلم بھی تھے، امام غزالی کے بعد وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے فلسفہ اور علم کلام کے مسائل پر تنقیدی نگاہ ڈالی، اور انکو جامعیت اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا، اس لیے امام غزالی اور مولانا روم کی طرح ان پر بھی اردو میں ایک مستقل کتاب کی ضرورت تھی، اسی ضرورت کے پیش نظر اس کتاب کی تالیف عمل میں آئی، اس میں ان کے مفصل حالات، اور ان کی تصانیف پر تبصرہ اور ان کے فلسفہ، علم کلام اور نظریات و خیالات کی توضیح و تشریح اور ان پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے،

**حکمائے اسلام** دو جلدیں۔ فلسفہ کی تمام شاخوں طبیعیات، الٰہیات، منطق اور ریاضی وغیرہ میں مسلمان حکما، و فلاسفہ کے بڑے کارنامے ہیں، یونان کا فلسفہ ان ہی کے دم سے زندہ رہا، وہ قدیم اور جدید فلسفہ کی درمیانی کڑی تھے، اگر انھوں نے قدیم فلسفہ کو زندہ نہ رکھا ہوتا تو آج کے نئے فلسفہ کا وجود نہ ہوتا، اور نہ بعض دوسرے علوم پیدا ہوئے ہوتے، مسلمان محض یونانی فلسفہ کے مقلد نہ تھے، بلکہ اس کے ناقد بھی تھے، انھوں نے اس کی تہذیب و اصلاح کی اور فلسفہ میں نئے



نظریات پیدا کیے، ان فلاسفہ کے متعلق ایک عام شہرت یہ بھی ہے کہ وہ ملحد و بے دین تھے جو علی الاطلاق صحیح نہیں ہے، بہت سے اکابر فلاسفہ نے فلسفہ کے ملحدانہ نظریات کی تنقید و تردید کی، اس سے مذہب کی تائید کا کام لیا، مابعد الطبیعی مسائل کو فلسفہ سے ثابت کیا، اور عقلیات و نقلیات میں تطبیق دی، اس لیے اردو میں مسلمان فلاسفہ کے حالات اور ان کے فلسفیانہ اور متکلمانہ کارناموں کو پیش کرنے کی بھی ضرورت تھی، اس اہم کام کو بھی مولانا کے آزمودہ کار قلم نے انجام دیا، اور دو ضخیم جلدوں میں مسلمان فلاسفہ کے حالات لکھے، اس میں تاریخ اسلام کے پہلے نامور فلسفی یعقوب کندی سے لیکر مولانا فضل حق خیرآبادی تک ہر دور کے اکابر فلاسفہ مثلاً محمد بن موسیٰ خوارزمی، فارابی، زکریا رازی، ابن مسکویہ، ابن ہیثم، مہندسین اخوان الصفا، شیخ الرئیس بو علی سینا، ابو ریحانی بیرونی، امام غزالی، ابوالبرکات بغدادی، عمر خیام، ابن باجہ، ابن طفیل، شیخ الاشراق، ابن رشد، امام رازی، نصیر الدین طوسی، قطب الدین شیرازی، قطب الدین رازی، سعد الدین تفتازانی، سید شریف جرجانی، جلال الدین دوانی، قوشجی، میر باقر داماد، خاندان فرنگی محل و خیرآباد اور ہندوستان کے دوسرے نامور حکما، کل ۶۷ فلاسفہ کے حالات ہیں اور ان کے علمی خدمات و فلسفیانہ نظریات کی تفصیل بیان کی ہے، کتاب کے شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں حکمائے قدیم کے فلسفیانہ مذاہب، فلسفہ اشراق، مسلمانوں میں یونانی فلسفہ کی اشاعت کی تاریخ اور ان کے قدیم مرکزوں کا حال لکھا ہے، جس سے مسلمانوں میں فلسفہ کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے، اردو میں اس موضوع پر یہ پہلی جامع کتاب ہے،

**شعر الہند** دو جلد۔ اردو میں شعراء کے قدیم طرز کے بہت سے تذکرے ہیں، لیکن وہ موجودہ نقطۂ نظر سے ناقص اور سپاٹ ہیں، ان سے شعرا کے ضروری حالات، اور ان کے کلام کی خصوصیات بھی پوری طور سے معلوم نہیں ہوتیں، ان میں نہ ادوار کی تقسیم ہے، نہ شاعری کے عہد بعہد کے تغیرات اور اس کے اسباب پر بحث ہے، نہ شعرا کے کلام پر تفصیلی رائے ہے جس سے ان کی خصوصیات

کا اندازہ ہو سکے، نہ اصنافِ شاعری پر بحث و تبصرہ ہے، بس صرف شاعروں کا مختصر حال اور انکے کلام کے متعلق ایک دو فقرے ہوتے ہیں، جن سے ان کی خصوصیات کا پورا اندازہ نہیں ہوتا، اس حیثیت سے سب سے پہلے مولانا محمد حسن آزاد نے اردو شاعری کو آبحیات پلایا، اور جدید نقطۂ نظر سے آبحیات لکھی، جس سے ایک حد تک یہ کمی پوری ہوگئی، آبحیات ادبی حیثیت سے غیر فانی ہے، جب تک اردو زبان زندہ ہے، آبحیات زندہ رہے گی لیکن وہ نقش اول ہے۔ اس لیے اس میں بھی وہ جامعیت نہیں ہے، جو اردو شاعری کی تاریخ کے لیے ضروری ہے، اسکی حیثیت ایک تاریخی و تنقیدی تذکرہ کی ضرور ہے مگر اس میں اصناف شاعری کی تاریخ اور اس پر ریویو نہیں ہے، بعض اور خامیاں بھی ہیں، نواب امداد امام اثر کی کاشف الحقائق میں صرف اصناف شاعری پر نقد و تبصرہ ہے، اس لیے وہ بھی جامع نہیں ہے، مولانا عبد السلام کو شعر و ادب سے فطری لگاؤ تھا، اور اس پر انکی نظر بڑی وسیع تھی، چنانچہ انھوں نے مولانا شبلی کی شعر العجم کے طرز پر شعر الہند لکھی، اسکی پہلی جلد میں اردو شاعری کی ابتدا سے لیکر فانی، حسرت، اصغر، شاد عظیم آبادی، عزیز لکھنوی، اکبر، اقبال، جوش یعنی جدید دور تک کے شعرا کا تذکرہ ہے، اور ان کے مختلف دور قائم کرکے ہر دور کے شعرا کے الگ الگ حالات، اس دور اور اسکے شعرا کی خصوصیات، عہد بعہد کے تغیرات اور اسکے اسباب کی پوری تفصیل ہے، اس حصہ کے شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں اردو شعرا کے قدیم تذکروں کی فہرست، ان کی کیفیت تحریر کی گئی ہے، دوسرے حصہ میں اصناف شاعری یعنی غزل، ریختی، واسوخت، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، ڈراما، اور مذہبی، صوفیانہ، اخلاقی اور فلسفیانہ شاعری پر تاریخی اور ادبی حیثیت سے مفصل ریویو کیا گیا ہے، جس سے اس کی پوری سرگذشت سامنے آجاتی ہے، آخر میں شعر کے اجزا اور اسکے محسنات لکھے گئے ہیں، اور اردو شاعری میں ہندوستانی اثرات دکھائے گئے ہیں، اس حصہ کے شروع میں اردو میں تنقید کی تاریخ پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے، اس طرح آب حیات کے بعد



شعر الہند اردو شعرا کا پہلا جامع تذکرہ ہے، جس سے اردو شاعری کے تمام رخ سامنے آجاتے ہیں، اب تو اس کے ایک ایک پہلو پر مستقل کتابیں لکھی جاچکی ہیں، مگر جب شعر الہند تالیف ہوئی اس وقت اردو میں آب حیات اور کاشف الحقائق کے علاوہ اور کوئی نمونہ سامنے نہ تھا،

**اقبال کامل** - اقبال اور ان کے کلام کے متعلق اتنا لکھا جاچکا ہے کہ مشکل ہی سے اس کا کوئی پہلو تشنہ ہوگا، مگر اس کا سلسلہ ابتک جاری ہے، اور لکھنے والوں کو عجیب و غریب نئے نئے پہلو تلاش کرنا پڑتے ہیں، مگر اس کے باوجود کوئی ایسی جامع کتاب نہ تھی جو اقبالیات کے ہر پہلو پر حاوی ہو، اقبال کامل کی تالیف کا مقصد یہ تھا کہ ابتک اقبال پر جو کچھ لکھا جاچکا ہے، اس کو نقد و تبصرہ کے ساتھ مرتب طریقہ سے ایک جگہ جمع کر دیا جائے، چنانچہ اس میں اقبال کے سوانح، انکی مذہبیت، اخلاق و سیرت اور تصانیف پر تبصرہ اور ان تصانیف کا بھی ذکر ہے جن کی تالیف انکے پیش نظر تھی، مگر اس کو پورا نہ کر سکے، اس کے بعد ان کی شاعری کی تاریخی سرگذشت اور اسکے مختلف دور قائم کرکے ہر دور کے کلام پر الگ الگ تبصرہ کیا گیا ہے، پھر اسی طریقہ سے فارسی شاعری پر ریویو ہے، اس کے بعد ان کے کلام کے ادبی محاسن دکھائے گئے ہیں، اور اس کی شہرت و مقبولیت اور مختلف زبانوں میں اس کے تراجم کا ذکر ہے، اس سلسلہ میں انکی ادبی و لسانی فروگذاشتیں بھی دکھائی گئی ہیں، پھر ان کے فلسفۂ خودی پر تفصیلی بحث ہے، اور اس کے اجزا و عناصر پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور فلسفۂ بیخودی کا اجمالی تعارف ہے، پھر نظریۂ ملت، تعلیم، سیاسیات، صنعت، فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کے بارہ میں ان کے خیالات پیش کیے گئے ہیں، آخر میں نعتیہ کلام پر ریویو ہے، اس طرح یہ کتاب اقبالیات کے ہر پہلو پر حاوی ہے، اور جن معلومات کے لیے ہزاروں صفحات کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے، وہ اقبال کامل میں ایک جگہ مل جاتی ہیں۔

ان مستقل تصانیف کے علاوہ مولانا نے عربی کی متعدد اہم کتابوں کے ترجمے کیے مثلاً

**تاریخ فقہ اسلامی**۔ اردو میں فقہ اسلامی کی کوئی تاریخ نہیں تھی، اس لیے دار المصنفین کے پیش نظر اس کی تالیف بھی تھی، مگر اسی زمانہ میں مصر کے ایک فاضل محمد خضری کی کتاب تشریع الاسلامی شائع ہوگئی جس سے دار المصنفین کے پیش نظر کتاب کا مقصد پورا ہو جاتا تھا، اس لیے مولانا نے اس کو اردو کے قالب میں ڈھال دیا، یہ فقہ اسلامی کی مفصل تاریخ ہے جس میں ہر دور کے فقہ وفقہا کے حالات، ان کے مذاہب، ان کی خصوصیات اور ان کے علل واسباب وغیرہ ہر پہلو کو تفصیل کے ساتھ دکھایا گیا ہے، اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک اسلامی علوم کی ترقی کا دور رہا فقہ اسلامی بھی ترقی کرتی رہی، اس کے بعد اس پر بھی زوال طاری ہو گیا،

**ابن خلدون**۔ مصر کے نامور فاضل ڈاکٹر طہ حسین نے ابن خلدون اور اس کے فلسفہ پر ایک کتاب فرنچ میں لکھی تھی، مصر میں اس کا عربی ترجمہ ہوا، یہ کتاب اسی عربی ترجمہ کا ترجمہ ہے، ابن خلدون نہ صرف مسلمانوں بلکہ دنیا کے مورخین میں فلسفۂ اجتماعیات کا پہلا عالم ہے جس نے عمرانی مسائل پر سب سے پہلے فلسفیانہ نگاہ ڈالی، اور اس کو علمی طور سے مرتب کیا، چنانچہ اس کا مقدمہ اس کے زمانہ تصنیف تک کے انسانی علوم وخیالات پر سب سے پہلا تبصرہ، تاریخی واقعات کو سائنس بنانے کی سب سے پہلی کوشش، اور اقتصادیات واجتماعیات پر فن کی حیثیت سے پہلی نگاہ ہے، اس حیثیت سے یہ مقدمہ موجودہ دور کے بہت سے علوم ومسائل کا گویا سنگ بنیاد ہے، طہ حسین کی کتاب میں ابن خلدون کے مختصر حالات اور اس کے سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی وعمرانی نظریوں پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے،

**انقلاب الامم**۔ یہ کتاب مشہور فرانسیسی عالم ومفکر گستاولی بان کی کتاب کے عربی ترجمہ کا ترجمہ ہے، اس میں ان نفسی اصول اور اخلاقی قوانین کی تشریح کی گئی ہے، جن سے قوموں کی ترقی اور ان کا تنزل وابستہ ہوتا ہے، یعنی جس طرح افراد میں ایک مخصوص روح ہوتی ہے جس کے مطابق اس کے تمام افعال صادر ہوتے ہیں، اسی طریقہ سے قوموں میں بھی مخصوص اخلاق وعادات ہوتے ہیں



جن پر ان کی ترقی وتنزل کا مدار ہوتا ہے، اس کتاب میں قوموں کے ان ہی اخلاق وعادات اور اس کے مظاہر ونتائج کو دکھایا گیا ہے،

ان اہم تصانیف وتراجم کے علاوہ چند اور چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں مثلاً

**القضا فی الاسلام**۔ یعنی اسلام کا نظام عدالت، اس کتاب میں شہادت اور فصل مقدمات کے اسلامی قوانین واصول تحریر کیے گئے ہیں اور ان کی تشریح کی گئی ہے، اس کا خاکہ مولانا کے ذہن میں ابن جوزی کی کتاب الطرق الحکمیہ سے آیا تھا، اگرچہ اس کتاب میں حدیث وفقہ کی دوسری کتابوں سے بھی مدد لی گئی ہے، مگر زیادہ تر الطرق الحکمیہ سے ماخوذ ہے،

**فقرائے اسلام**۔ علامہ شہاب الدین احمد بن علی دلجی نے ان علماء کے حالات میں جنھوں نے علمی کمالات کے باوجود فقر وفاقہ کی زندگی بسر کی ہے، ایک کتاب "الفلاکۃ والمفلوکون" لکھی ہے، فقرائے اسلام حذف واضافہ کے ساتھ اسی کی تلخیص ہے، یہ کتاب صوفی پبلشنگ کمپنی پنڈی بہاء الدین نے شائع کی تھی،

**ابن یمین**۔ عرصہ ہوا ابن یمین اور اس کے کلام پر ایران سے فارسی میں ایک کتاب شائع ہوئی تھی، مولانا نے اردو میں اس کی تلخیص کی تھی، یہ کتاب بھی پنجاب کے کسی ناشر نے شائع کی تھی، اور اس وقت ہمارے سامنے نہیں ہے،

مولانا کی دلچسپی کسی خاص فن تک محدود نہ تھی، اس لیے ان کا کوئی موضوع بھی متعین نہ تھا، شعر وادب سے ضرور ان کو فطری لگاؤ تھا، مگر ان کے قلم کی جولانیاں اس دائرے میں محدود نہ تھیں، اور وہ ہر موضوع پر ہر وقت لکھنے کے لیے تیار رہتے تھے، اور جس طرف چاہتے تھے قلم کی باگ موڑ دیتے تھے، اسی لیے جو تنوع اور رنگارنگی ان کے مضامین میں ہے مشکل سے کسی دوسرے اہل قلم کے مضامین میں نظر آسکتی ہے، ان کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ اگر ان کی پوری فہرست نقل کی جائے

تو کئی صفحوں میں آئیگی، اسلیے مختصر فہرست لکھی جاتی ہے، جس سے ان مضامین کے تنوع کا اندازہ ہوگا،

مسجد نبوی، جنگ اور اخلاق، خلفاے عباسیہ اور فریضۂ اشاعت اسلام، تربیت و تعلیم، اسلامی یتیم خانے، تحریفات یہود، مثنوی خواب وخیال، کیا انسان کی اجتماعی زندگی ترقی کر رہی ہے؟ فلسفہ لیبان، اسلام اور نصرانیت کی کشمکش، مشرقی کتب خانے، عیسائی مذہب کی تمدنی ناکامیاں، مذہبی عقلیات، اسلام کی تمدنی کامیابیاں، قرآن مجید اور شاعری، دین حنیف، خوش قسمت حافظ اور بد قسمت خیام، طلاق عیسائی مذہب میں، اشرف علی خاں فغاں، وحدۃ الوجود اور اکابر اسلام، اسلام اور عیسائیت، شیخ مصحفی کا تذکرہ، فن تراجم وطبقات، تحریم سود کے علل و اسباب، مسلمانوں کے تنزل کی داستان، مہندسین اسلام، عقیقہ اور اس کے مصالح، امام غزالی اور فلسفۂ اخلاق، سوشلزم کی مختلف حیثیتیں اور اس کی اشاعت کے اسباب، القضا فی الاسلام، شیریں و فرہاد، معتزلہ اپنی اصلی شکل میں، اسلام اور مغربی لباس وتمدن، اسلامی اقتدار کا اثر یورپ کی معیشت پر، فلسفۂ جمال اور اس کا اثر تصوف پر، خصائص القرآن، ایک قدیم ذہنی شعر اندلس کے عربی آثار، فرانسیسی شاعری اور اس پر عربی ادب کے اثرات، اسلام اور تکمیل اخلاق، اسلامی فن تعمیر، رہبانیت اور اسلام، کلیات حسن دہلوی، تصوف کی اجمالی تاریخ، تصوف کا اثر علوم وفنون پر، صوفیانہ نظام اخلاق، مولانا کاتبی، موفق الدین عبد اللطیف بغدادی، فلسفہ اشراق اور اسلام، اقبال اور فلسفۂ خودی، اسلامی طب کی مختصر تاریخ، اقبال کے اخلاقی تصورات، اسلامی ہند کے تمدنی کارنامے، عربی نظم ونثر کی تاریخ، معجزۂ قرآن کی نوعیت، فلسفۃ البلاغۃ، اردو شاعری میں انقلاب کیونکر پیدا ہوا، دلی اور لکھنؤ کی شاعری اور ایک کا دوسرے پر اثر،

مولانا طبعاً خاموش، گوشہ نشین اور نام ونمود سے بے نیاز تھے، اور اس کے جو مواقع بھی انکو ملتے تھے، اس سے بھی فائدہ نہ اٹھاتے تھے، اور پروپیگنڈے کے فن سے تو بالکل ہی ناواقف تھے،



اس لیے پبلک اسٹیج سے ہمیشہ الگ رہے، اور ان کا دائرۂ عمل دار المصنفین کے اندر تالیف وتصنیف تک محدود رہا، حتی کہ خالص علمی اجتماعات میں بھی تقریر، مقالہ خوانی یا صدارت کی نوبت شاید ہی کبھی آتی ہو، ایک دو مرتبہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے جلسہ میں البتہ شرکت کی تھی، اور "اردو شعرا کے ایک اچھے انتخاب کی ضرورت" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا، جو اسی زمانہ میں معارف میں شائع ہو گیا تھا، اور ایک مرتبہ عرصہ ہوا، کانپور کے کسی ادبی اجتماع میں شعبۂ نثر کی صدارت کی تھی اور اس کے لیے خطبۂ صدارت بھی لکھا تھا، یہ خطبہ بھی معارف میں چھپا تھا، اس جلسہ میں ہم لوگوں نے بڑے اہتمام سے مولانا کو روانہ کیا تھا، وہ منظر آج تک آنکھوں کے سامنے ہے، مگر وہ سفر سے اس قدر گھبراتے تھے کہ اس کے بعد غالباً کسی علمی جلسہ کے لیے سفر نہیں کیا، اس لیے ایسے علمی مقالات اور خطبۂ صدارت کی تعداد جو کسی علمی اجتماع میں پڑھے گئے ہوں دو چار سے زیادہ نہیں ہے، البتہ مقامی مشاعروں کی صدارت بڑے شوق سے کرتے تھے، اور اس کے لیے قریب کے اضلاع کا کبھی کبھی سفر بھی کرتے تھے،

ایک زمانہ میں کبھی کبھی تقریر بھی کرتے تھے، اور اگر اصرار کیا جاتا تھا تو وعظ بھی کہہ دیتے تھے، مگر جیسا کہ آیندہ معلوم ہوگا، جذب کی وجہ سے ان کے خیالات میں توازن نہ تھا، اس لیے تقریر یا وعظ کے حدود وقیود کی پابندی سے بری رہتے تھے، اس لیے وہ خود بھی اس سے بچتے تھے اور روکے بھی جاتے تھے، وہ طبعاً خاموش تھے، مگر بعض خاص موضوعوں پر بڑی دلچسپ اور شاعرانہ گفتگو کرتے تھے، جو سننے کے لائق ہوتی تھی،

مولانا کا اصلی موضوع شعر وادب تھا، اس سے ان کو فطری مناسبت تھی، اور اردو، فارسی شعر وادب خصوصاً اردو شاعری سے بڑی دلچسپی تھی، اتفاق سے شروع سے ان کو ماحول بھی ایسا ملا جس سے اس ذوق کے نشو ونما میں اور مدد ملی، ان کے بہنوئی مولوی محبوب الرحمن صاحب مرحوم

بی ، اے ، ایل ، ایل بی ، جن کے ساتھ مولانا عرصہ تک رہے ، شاعر تھے ، اور کلیم تخلص کرتے تھے ، مولانا اپنی طالب علمی کے زمانہ میں ان ہی کے ساتھ کانپور اور آگرہ گئے تھے ، یہ وہ زمانہ تھا جب گھر گھر شعرو شاعری کا چرچا تھا ، اور آگرہ اس کا بڑا مرکز تھا ، چنانچہ محبوب الرحمٰن صاحب اور ان کے ساتھ مولانا بھی یہاں کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے ، ان صحبتوں نے مولانا کے ذوق شعری کو بھی ابھارا ، اور کبھی کبھی وہ غزلیں کہہ کر مشاعروں میں پڑھنے لگے ، اس کے بعد غازیپور کی تعلیم کے زمانہ میں ان کو مولانا عبدالاحد شمشاد مرحوم فرنگی محلی کی ، جو چشمۂ رحمت میں مدرس اعلیٰ اور اپنے زمانہ کے اساتذہ میں تھے ، شاعرانہ صحبت میسر آئی ، ان کی صحبت اور حوصلہ افزائی سے مولانا کے ذوق سخن کے لیے مہمیز کا کام کیا ، اور وہ باقاعدہ شاعری کرنے اور مولانا عبدالاحد سے اصلاح لینے لگے ، ان کی فارسی استعداد شروع سے پختہ اور فارسی اور اردو کے اساتذہ کے کلام پر پوری نظر تھی ، اس لیے ابتدائی مشق سخن میں اس زمانہ کے مذاق کے اچھے اشعار نکلنے لگے ، جن کی داد اس دور کے اساتذہ نے دی ، مثلاً

میں مرگیا ہوں یہ کس غیرتِ چمن کیلیے — کہ لائیں چادرِ گل بلبلیں کفن کیلیے

بدگمانی سے انھیں میری نظر وہ سمجھے — چمکے ذرے بھی اگر روزنِ دیوار کے پاس

کانپور کے بعد وہ اردو شاعری کے اصل مرکز لکھنؤ پہنچ گئے ، یہاں کے در و دیوار سے شاعری برستی تھی ، پرانے اساتذہ کی متعدد یادگاریں باقی تھیں ، لکھنؤ کی فضا امیر مینائی اور جلال لکھنوی کی زمزمہ سنجیوں سے گونج رہی تھی ، خود مولانا شبلی کی صحبت میں بھی شعر و ادب کا چرچا رہتا تھا ، اس ماحول نے مولانا کو پورا شاعر بنا دیا ،

اس زمانہ میں لکھنؤ میں میر ضامن علی جلال کا طوطی بولتا تھا ، اور ان کا رنگ بہت مقبول تھا ، اس لیے مولانا بھی اس سے متاثر ہوئے ، اور اصلاح کے لیے جلال کی جانب رجوع کیا ، لیکن



مولانا ہی کے بیان کے مطابق وہ نذرانہ لیے بغیر اصلاح نہیں دیتے تھے ، جس کا تحمل طالب علمی کے زمانہ میں مولانا کے لیے دشوار تھا ، اس لیے یہ تعلق قائم نہ ہو سکا ، مگر اس سے جلال کے ساتھ انکی عقیدت میں کوئی فرق نہ آیا اور وہ ہر دور میں یکساں قائم رہی ،

اقبال سہیل مرحوم اور مرزا احسان احمد صاحب کے ذوق سخن کی وجہ سے اعظم گڈھ میں بھی شعر و شاعری کا مذاق تھا ، جگر و اصغر اکثر آتے رہتے تھے ، اور دار المصنفین و مرزا صاحب کے یہاں شعر و شاعری کی محفلیں جمتی تھیں ، مشاعرے بھی ہوتے تھے ، اس لیے مولانا عبدالسلام کو یہاں بھی شاعرانہ ماحول ملا ، وہ ان صحبتوں اور مشاعروں میں برابر شریک ہوتے تھے ، اور اکثر غزلیں بھی پڑھتے تھے ، اور ان کا یہ ذوق آخر عمر تک قائم رہا ، چنانچہ آخری غزل انھوں نے وفات سے ایک ہفتہ پہلے کہی تھی ،

فن شاعری پر مولانا کی نظر بڑی گہری اور استادانہ تھی ، جس کا ثبوت ان کی کتاب شعر الہند ہے ، وہ قدیم طرز سخن کے دلدادہ اور خود بھی اس کے پابند تھے ، دور جدید کی بعض جدتوں بلکہ بدعتوں کو سخت ناپسند کرتے تھے ، اور اس کو شاعری نہیں سمجھتے تھے ، اس پر انھوں نے ایک تنقیدی مضمون بھی لکھا تھا جس میں دور جدید کے بہت سے شعرا کی غلطیاں دکھائی تھیں ، اس کی اشاعت سے ایک ادبی ہنگامہ برپا ہو جانے کا خطرہ تھا اس لیے شائع نہیں کیا گیا ، اور اس کا مسودہ ابتک محفوظ ہے ، فن کے قواعد کی پابندی اور زبان کی صحت و صفائی کو بڑی اہمیت دیتے تھے ، اور اس حیثیت سے وہ لکھنؤ کی شاعری کو دلی کی شاعری پر ترجیح دیتے تھے ، ان کو لکھنؤ کا اصلاح شدہ رنگ بہت پسند تھا ، اس لیے جلال کو آخری دور کا سب سے بڑا شاعر مانتے تھے ، اور خود بھی اسی رنگ میں کہتے تھے ، مگر کبھی کبھی داغ و امیر کے رنگ کے شوخ اشعار بھی قلم سے نکل جاتے تھے ،

مگر اس ذوق کے باوجود شاعری ان مستقل مشغلہ نہ تھا ، بلکہ کبھی کبھی تفنناً یا اعظم گڈھ کے

شاعروں پر کہتے تھے، چنانچہ ان کی اکثر غزلیں اسی کی یادگار ہیں، اسی لیے ان کے ذوقِ شعری کے مقابلہ میں ان کے کلام کی مقدار بہت کم ہے، مگر جس قدر بھی ہے پرانے طرز کا استادانہ ہے، اس پر تفصیلی تبصرہ کے لیے مستقل مضمون کی ضرورت ہے، اس لیے بغیر کسی تبصرہ کے مختلف رنگ کے اشعار نقل کیے جاتے ہیں، جس سے ان کے رنگِ سخن کا اندازہ ہو جائے گا،

ان کے مجموعۂ کلام کی اشاعت کی نوبت نہ آئے گی، اس لیے کچھ زیادہ اشعار نقل کر دیے جاتے ہیں کہ اسی ذریعہ کم سے کم ایک مختصر انتخاب محفوظ ہو جائے۔

نشہ میں ہیں کبھی تو کبھی ہیں خمار میں    اچھی گذر رہی ہے ترے انتظار میں
گذرے گا روزِ حشر بھی اب انتظار میں    شامل ہو یہ بھی وعدۂ فردائے یار میں
چپ چاپ بھی نہ بیٹھ سکے بزمِ یار میں    مجبوریاں بھی غیر کے تھیں اختیار میں
تارے بھی جھلملا کے بہ حسرت ہوئے غروب    کیا کیا بجھے چراغ شبِ انتظار میں
توڑے سبو کو خاک کہ اب محتسب کو بھی    خود لطف آ رہا ہے شکستِ خمار میں
اے چشمِ شوق جلوۂ محبوب کے سوا    کیا کیا نہ دیکھنا ہے تجھے انتظار میں
لاکھوں قفس ہیں لائے گی کس کس میں بوئے گل    جڑ بیٹھنے لگے گی سانس صبا کی بہار میں

---

چہرے تک ان کے مست گئی بے خبر گئی    جب جب گئی نگاہ بنوعِ دگر گئی
دشوار ہو گئے ہیں اشارے بھی ضعف میں    اس کام سے بھی اب تو ہماری نظر گئی
سامانِ غم بھی ہجر کی شب منتشر ہوا    تڑپے تو آنسوؤں کی لڑی بھی بکھر گئی
گو جس کی جستجو تھی وہ یوسف نہیں ملا    لیکن مری نگاہ سے دنیا گذر گئی
یوسف کو سستے دام زلیخا نے لے لیا    تقدیر تھی کہ حسن کی قیمت ٹھہر گئی

---

غبارِ معصیت کی اس طرح کی شست و شو برسوں    مئے صافی سے اے زاہد کیا میں نے وضو برسوں



زبانِ بے زبانی ہم سے بڑھ کر کون سمجھے گا    تری تصویر سے فرقت میں کی ہے گفتگو برسوں
نگاہِ شوق کی خودداد اس کے عکس سے لی ہے    اک آئینہ کو رکھ کر ہم نے اسکے روبرو برسوں
نہ پیاس اپنی بجھے گی بادۂ کوثر سے جنت میں    رہے گی روح میری کشتۂ جام و سبو برسوں

---

جہاں دیکھتے ہیں جدھر دیکھتے ہیں    فقط اک فریبِ نظر دیکھتے ہیں
یہ صیاد کو کیوں پسند آئے اتنا    مرے ہم نوا میرے پر دیکھتے ہیں
اشارہ جو پائیں تو تم کو بھی دیکھیں    ابھی تو تمھاری نظر دیکھتے ہیں
نظر باز بنکر شمیم اس گلی میں    تماشائے اہلِ نظر دیکھتے ہیں

---

یوں آشیاں کو دیکھ رہے ہیں قفس سے ہم    گویا یہ کوئی بھول ہے فصلِ بہار کا
مستی میں کھینچ لیتے ہیں رندانِ مے پرست    دامن پکڑ کے رحمتِ پروردگار کا
لاکھوں مصیبتیں ہیں مگر پھر بھی روزِ حشر    محبوب ہے کہ دن ہے ترے انتظار کا
اے بیخودی بھٹک کے چلے آئے خلد میں    ہم راستہ ہی بھول گئے کوئے یار کا
سب کچھ اسے ملے جو یہ ہو جائے نا امید    بس آسرا ہے یہ ترے امیدوار کا

---

حریمِ دل سے یا عرشِ بریں سے    تمھیں ہم ڈھونڈھ لائینگے کہیں سے
ہوا مرنے پہ آغازِ محبت    شروع ہوتا ہے یہ قصہ یہیں سے
بجھے دل کا چراغ اے شمعِ رو آج    جلا دے اپنے روئے آتشیں سے
جو اس کی جستجو میں گھر سے نکلے    تو خود کھوئے گئے دنیا و دیں سے
مری تقدیر ایسی چاندنی میں    جو چمکے گی تو تم سے مہ جبیں سے
صدا اس بام تک اب بھی نہ پہنچی    پکار آئے اسے عرشِ بریں سے
فلک سے پہلے ہی کوچے میں انکے    نپٹ لینا پڑا ہم کو زمیں سے

چھپے چوری جو کچھ کرتا ہے زاہد — کھلا راز اس کا اک پردہ نشیں سے
تری انگڑائیاں کہتی ہیں مجھ سے — تجھے کچھ ملنے والا ہے کہیں سے

---

نشہ آتا ہے تو پھر وعظ بھی کہہ لیتے ہیں — پی کے ہم اور بھی ہشیار ہوئے جاتے ہیں
تیغ کی ان کو پئے قتل ضرورت کیا ہے — خود ہی کھنچ کھنچ کے وہ تلوار ہوئے جاتے ہیں
مست آنکھوں کے اشارے مجھے دیتے ہیں یہ طنز — بے پئے آپ تو سرشار ہوئے جاتے ہیں
ترے پہلو میں تو بیٹھے ہیں مگر غیر کے ساتھ — ہو کے آسان وہ دشوار ہوئے جاتے ہیں
مثل منصور جنھیں حق نے کیا ہے حق گو — اور بے باک سرِ دار ہوئے جاتے ہیں

---

جنھیں تیرے ہاروں میں گوندھا گیا ہے — بھلا کب ہیں وہ پھول مرجھانے والے
تم اپنا انھیں کشتۂ ناز کہہ دو — ابھی جی اٹھیں گے یہ مرجانے والے
متاعِ دل و جاں کریں نذر پہلے — کچھ اپنا بھی کھوئیں انھیں پانے والے

---

لیں گے اوچک کے بادۂ کوثر کا جام بھی — پہنچا جو ہاتھ دامنِ ابرِ بہار تک
رندو بھرا ہے جام یہ جم تک کے ہاتھ میں — مٹ مٹ گئے ہیں اسکے تو نقش و نگار تک
اللہ رے غرور پہنتے نہیں کبھی — گردن جھکا کے آپ تو پھولوں کا ہار تک

---

رندوں میں یوں ہی بخشش پیر مغاں رہے — ہو لاکھ قحط پھر بھی یہ دریا رواں رہے
رخصت ہوں وہ تو اشک مسلسل رواں رہے — یوسف کے ساتھ ساتھ لگا کارواں رہے
بجلی بھی اس کے ڈر سے گرے گی نہ باغباں — ہاں ہاں تری نظر میں مرا آشیاں رہے

---

مرے دل سے آخر وہ باہر کہاں ہیں — رقیب اپنے، اپنے ہی وہم و گماں ہیں
پڑیں بھی تو کیا مجھ پہ شرمائی نظریں — نہ یہ جانفزا ہیں نہ یہ جاں ستاں ہیں
ٹے گا وہ کوچہ تو آوارگی سے — مری رہنما میری گمراہیاں ہیں

---



پی کے چلو میں تو میخانے سے ہم اٹھتے نہیں — لے نہ لیں ساقی سے جب تک جام جم اٹھتے نہیں
رہنما اس حد سے آگے تو ہی خود لے شوق ہو — تھک گئے ہیں خضر، اب انکے قدم اٹھتے نہیں
راہ بے پایاں تھی وجہ گرم رفتاری شمیم — قرب منزل نے تھکایا اب قدم اٹھتے نہیں

---

کردے بیخود سونگھا کے زلف کی بو — چھین لے آج مجھکو تو مجھ سے
یاد اس چشمِ مست کی آئی — چھین لو ساغر و سبو مجھ سے
ہیں اشارے یہ موجِ مے کے شمیم — کر لو بھی آج تم وضو مجھ سے

---

ہر ایک خار ہے رنگین خون بلبل سے — خزاں کے آنے پہ بھی یہ بہار باقی ہے
بکھر کے زلف نے رخ پر بڑھائی ظلمت اور — وہ آئے پھر بھی شبِ انتظار باقی ہے
ہر ایک پر مرے اڑتے ہیں برگ گل کی طرح — خزاں میں بھی یہ نشاط بہار باقی ہے

---

محو ہے گلگشت میں وہ گل عذار ابکی برس — کیا بہار باغ ہے باغ و بہار ابکی برس
ساغرِ گل دے رہا ہے جامِ جم ہر ہاتھ میں — ہر فقیر بے نوا ہے شہریار ابکی برس

---

کسے خبر ہے کہ در پردہ نیتِ زاہد — شریک صحبت رندان بادہ خوار میں ہے
جنون عشق میں ہو پختگی اگر تو شمیم — خزاں میں بھی ہو وہی رنگ جو بہار میں ہے

---

چلو جنت میں شغل ساغر و پیمانہ ہو جائے — جگہ پر لطف ہے اک صحبت رندانہ ہو جائے
ذرا تو ہاتھ تو رکھ دے کسی کے روئے روشن پر — مرا دامن جو اے زاہد ید بیضا نہ ہو جائے

---

کیا عقد ثریا مری نظروں میں سمائے — یہ تو ہے بس اک اترا ہوا ہار تمہارا
دیوانو! یہ عزت تمھیں بخشی ہے جنوں نے — وابستۂ دامن ہے ہر اک خار تمہارا

---

خزاں دیدہ جو کچھ پتے پڑے تھے آشیانے میں — انھیں کو برگِ گل سمجھے انھیں کو بال و پر جانا
کڑی ہے دھوپ محشر کی ٹھہر اے اخگر ناداں — ہمارے ساتھ زیرِ سایۂ دامانِ تر جانا

ان کے علمی و ادبی کمالات اور کارناموں کی تفصیل کے بعد ان کی سیرت اور عادات خصائل کی مرقع نگاری بھی ضروری ہے، اس کے بغیر انکی پوری تصویر سامنے نہ آئے گی، اور ان کی خصوصیات کا صحیح اندازہ نہ ہوگا، گو حسن و جمال کی طرح ان کی اداؤں کی مصوری بہت دشوار ہے، تاہم اس کا اجمالی خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے،

وہ ایک علمی مجذوب اور اپنی خصوصیات میں یگانہ تھے، ان میں بعض ایسی خوبیاں تھیں جو اس زمانہ میں ناپید ہیں، یا کم از کم ان کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، وہ نہایت نیک سیرت بے نفس اور مرنجان مرنج انسان تھے، ان کی ذات سے کبھی کسی کو ادنیٰ تکلیف بھی نہیں پہنچی، ان میں ایذارسانی کا مادہ ہی نہ تھا، حقوق العباد سے ان کا دامن اتنا پاک تھا کہ کسی کا ادنیٰ حق بھی ان کے ذمہ نہ تھا، اور ان کے رفقاء و متوسلین میں مشکل ہی سے کوئی ایسا شخص ہوگا جن کے ذمہ ان کا کوئی حق نہ ہو، معاملات کے اس قدر صاف تھے کہ کسی کا ایک حبہ بھی باقی نہ رکھتے تھے، بازار کے معمولی حساب کتاب کے سوا ان کو کسی سے قرض لینے کی ضرورت ہی نہ پیش آتی تھی، تنخواہ ملنے کے بعد سب سے پہلے حساب چکاتے تھے، جب تک پورا حساب صاف نہ ہو جاتا ان کو چین نہ آتا حتی کہ اگر دھوبی اور مہتر وغیرہ وقت پر نہ پہنچتے تو گھر جا کر ان کی تنخواہ دے آتے، مگر جس مستعدی سے اپنا قرض ادا کرتے تھے، اسی مستعدی سے دوسروں سے بھی وصول کرتے تھے، اور وقتاً فوقتاً یاد دلاتے رہتے تھے، کبھی کبھی بھرے مجمع میں یاد دہانی کر دیتے اور تنخواہ ملنے کے ساتھ ہی وصول کر لیتے، ہم میں سے ہر شخص ان کا مقروض رہتا تھا اس کیلیے ان کو بڑی زحمت اٹھانا پڑتی تھی، ہر وقت چالیس پچاس کی رقم پاس رکھتے تھے اور یہ پوری رقم جیب ہی میں رہتی تھی، اس کے لیے کئی جیبوں کی واسکٹ پہنتے تھے اور اس کی حیثیت صراف کی دوکان تھی جس میں نوٹ سے لیکر ہر قسم کی ریزگاری ہوتی تھی، وہ قرض، خواہ چند پیسوں کا ہی ہو، بڑی ناگواری سے دیتے تھے، لیکن انکار بھی ان کے بس میں نہ تھا،



جس کو جس قدر ضرورت ہوتی تھی کسی نہ کسی طرح ان سے وصول ہی کر لیتا تھا، ان میں مقابلہ اور مدافعت کی مطلق طاقت نہ تھی کسی معاملہ میں خواہ ان کے مزاج کے کتنا ہی خلاف ہو، انکے لیے انکار پر قائم رہنا دشوار تھا، ان کی اس کمزوری سے ہر شخص فائدہ اٹھاتا تھا، چھوٹے چھوٹے بچے جھپٹ جاتے تھے اور بغیر پیسہ لیے نہ چھوڑتے تھے، دارالمصنفین میں جو مشترک مہمان بھی آتا تھا یا اکل و شرب کی جو اجتماعی تقریب بھی ہوتی اس کی زد زیادہ تر مولانا ہی پر پڑتی اور اسکی حیثیت "گپت دان" کی ہوتی تھی یعنی جس پر صرف ہوتا تھا اس کو پتہ بھی نہ چلنے پاتا تھا، اس قسم کے جبری ٹیکس اکثر مولانا کو ادا کرنے پڑتے تھے، مولانا مسعود علی صاحب نے اس کا نام جزیہ رکھا تھا،

بڑے قانع و بے نیاز تھے، حصول دنیا کی کبھی کوشش نہیں کی، اور ایک قلیل معاوضہ پر پوری زندگی گذار دی، دارالمصنفین میں تنہا وہی ایسے شخص تھے جس نے اس قلیل تنخواہ کے علاوہ جو ان کو ملتی تھی، دارالمصنفین کے ذریعہ اس کے اندر یا باہر کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، یہی حال شہرت سے بے نیازی کا تھا، اس سے وہ دور بھاگتے تھے، مصنفین اور اہل قلم کے طبقہ میں ان کی جیسی بے نیازی کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے، بے نیازی کی آخری حد یہ ہے کہ ان کو اپنے کمالات تک کا احساس نہ تھا، اور وہ اپنے ان کارناموں کو بھی کوئی اہمیت نہ دیتے تھے جن کی ایک دنیا معترف ہے، اس کا ذکر تک پسند نہ کرتے تھے، میں ان سے اکثر کہا کرتا تھا کہ تمام مصنفین و اہل قلم کسی نہ کسی بہانہ سے اپنے حالات اور کارنامے لکھ جاتے ہیں، آپ بھی لکھوا دیجئے، تاکہ آپکے بعد ہم لوگوں کو اس کے لکھنے میں کوئی دقت نہ ہو، وہ ہمیشہ بڑی بے پروائی سے جواب دیتے، میرے حالات ہی کیا ہیں، اور مرنے کے بعد ان کے لکھنے سے کیا حاصل، ان سطور کی تحریر کے وقت اس سوال و جواب کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے، اگر یہ حسن اتفاق ہے کہ نشاط و مسرت کے آخری دور میں جس کی تفصیل آیندہ معلوم ہوگی، ایک ہونہار نوجوان کبیر احمد جائسی نے جن کو لکھنے پڑھنے کا ذوق ہے،

ان کے حالات و شاعری پر ایک مضمون لکھکر ان کو دکھلایا، یہ مضمون ان کو کیا پسند آتا، انھوں نے ان کی حوصلہ افزائی کے لیے ایک مستقل مضمون ہی ان کی طرف سے لکھدیا جو دسمبر کے آجکل میں شائع ہوا ہے، یہ مضمون مولانا ہی کا ہے اور اس حیثیت سے بہت اہم ہے کہ خود مولانا کے قلم سے ان کے حالات ہیں۔

سیاست اور ریا و نفاق کے نام سے ناآشنا تھے، ان کا ظاہر و باطن بالکل ایک تھا، جو دل میں تھا وہی زبان پر، ان کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب تھی جس کو ہر شخص پڑھ سکتا تھا، وہ ایسی باتوں کے چھپانے پر بھی قادر نہ تھے جس کے اظہار کی جرأت بہت کم لوگ کرسکتے ہیں، ان کی اس سادگی اور صاف گوئی کی انتہا یہ تھی کہ اگر کسی مسئلہ یا کسی شخص کے متعلق ان کی رائے پوچھی جاتی تو ان کی جو رائے ہوتی بلاتکلف وہی ظاہر کرتے خواہ اس کا اظہار خلاف مصلحت ہی کیوں نہ ہوتا، اس صاف گوئی کے بدولت کبھی کبھی بڑی مشکل میں پھنس جاتے تھے، اس لیے کہ لوگ لطف و دلچسپی کے لیے اشخاص کے متعلق ان کی موجودگی میں سوال کردیتے تھے، اسوقت بھی مولانا وہی رائے دیتے جو ان کے دل میں ہوتی، مگر کسی معاملہ کے متعلق ان کی کوئی مستقل رائے نہ ہوتی تھی، بلکہ وقتی تاثرات کے مطابق بدلتی رہتی تھی، بڑے متحمل مزاج تھے، ناگوار سے ناگوار باتیں سنکر پی جاتے تھے اور چہرہ پر شکن تک نہ پڑتی تھی، غصہ ان کو بہت کم آتا تھا، جب کسی سے بہت زیادہ برہم ہوتے تو اس کو بیہودہ یا خبیث کہتے تھے، اور چونکہ ان کو ہر شخص چھیڑتا تھا اس لیے اس لقب سے بہت کم لوگ بچے تھے، خودی اور خودنمائی کا ان میں شائبہ بھی نہ تھا، ہر چھوٹے بڑے اور ادنیٰ و اعلیٰ سے ان کا برتاؤ یکساں تھا، ادنیٰ ملازمین تک ان سے بے تکلف تھے، اور ان سے فائدہ اٹھاتے تھے، وہ کسی سے اپنے احترام کے متوقع نہ ہوتے تھے، اور نہ اس کا ان پر کوئی اثر پڑتا تھا، وہ اصلی احترام یہی سمجھتے تھے کہ ان سے کوئی ناگوار بات نہ کیجائے، ان کے احترام اور مدارات کے لیے کسی بڑے



اہتمام کی ضرورت نہ تھی، خوش اخلاقی سے ملنا، ایک پیالی چائے پلادینا یا ایک پان کھلادینا بہت کافی تھا، خود بھی وہ دوسروں کی اسی قسم کی مدارات کے قائل تھے، ان کی زندگی اس قدر سادہ تھی کہ ناگزیر ضروریات زندگی کے علاوہ نمائش اور تعیش کا کوئی سامان کبھی نہیں رکھا، ان کی ساری کائنات دو بکس، چند جوڑے کپڑے، ایک بستر اور ایک پلنگ سے زیادہ نہ تھی جس کو ان کی وفات ہی کے دن شام کو ان کے ورثا ایک یکہ پر ساتھ لیتے گئے، وہ وقت ایسا تھا کہ یہ منظر دیکھکر بہتوں کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے، لیکن حقیقت شناس نگاہیں کہہ رہی ہیں کہ

سبک سار مردم سبک تر روند

ان کی بعض خصوصیات ایسی ہیں جن کا دکھانا بڑا نازک کام ہے، مگر اس کے بغیر انکی اہم خصوصیات کا ایک بڑا دلکش رخ سامنے نہ آئے گا، مگر انکو ایک خاص پس منظر میں دیکھنا ضروری ہے ورنہ اس کا پورا لطف نہ حاصل ہوگا، اور نہ انکے متعلق صحیح رائے قائم ہوگی، ان کو مراق کا پرانا مرض تھا، اور کبھی کبھی اس کے دورے بھی پڑتے تھے، اس لیے ان پر ہمیشہ جذب کی سی کیفیت طاری رہتی تھی، وہ کھوئے کھوئے سے رہتے تھے، اور ان کے خیالات اور اعمال میں توازن باقی نہ رہ گیا تھا، خصوصاً دورے کے زمانہ میں ان کو اپنے اوپر بالکل قابو نہ رہ جاتا تھا، اور وہ رُفع القلم عن ثلث کے حکم میں آجاتے تھے،

یوں تو کم و بیش ہمیشہ ان پر مراق کا اثر رہتا تھا، مگر کبھی کبھی اس کے دورے بھی پڑتے تھے، یہ دورے دو قسم کے ہوتے تھے، جن کو رجائی اور قنوطی کہہ سکتے ہیں، ان دوروں میں ان کو اپنے اوپر مطلق قابو نہ رہ جاتا تھا، رجائی دورے میں سراپا جوش و خروش، زندگی و حرکت اور نشاط و مسرت بن جاتے تھے، ان کے ہر موے بدن سے زندگی اور مسرت کے چشمے ابلتے تھے، ہر چیز میں انکو مسرت ہی مسرت اور حسن ہی حسن نظر آتا تھا، ان کے لیے ہر جلوہ جنت نگاہ اور ہر نغمہ فردوس گوش

بن جاتا تھا، اور وہ رسوم و قیود سے بے پروا اپنے حال میں مست و سرشار رہتے تھے، ہر وقت حرکت میں رہتے، بازار کے کئی کئی چکر لگاتے، دار المصنفین کے احاطہ میں ہر وقت چلتے رہتے، رات بھر ٹہل ٹہل کر اشعار پڑھتے، خصوصاً چاندنی راتوں میں پوری رات جاگتے تھے، اکثر زیر لب باتیں کرتے رہتے، طبیعت میں بڑی جودت پیدا اور قوت گویائی بڑھ جاتی تھی، اور علمی و مذہبی مسائل میں مجتہدانہ شان پیدا ہو جاتی، بات بات میں مباحثہ کے لیے تیار ہو جاتے اور انکی افتاد طبع کے خلاف تعلّی بھی پیدا ہو جاتی، کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے، گفتگو بھی بڑی شاعرانہ کرتے قلم میں بھی زور پیدا ہو جاتا تھا، مگر کوئی متوازن تحریر نہ لکھ سکتے تھے، تعدد ازدواج پر ان کا جو مضمون رسالہ ثقافت لاہور نے بڑے فخر و مباہات سے شائع کیا ہے، وہ اسی دورے کی یادگار ہے، طبیعت میں فیاضی بھی آجاتی تھی، دو دو چار چار آنے کی چھوٹی چھوٹی چیزیں خرید کر لوگوں کو تحفے میں دیتے، لباس میں بھی اہتمام پیدا ہو جاتا تھا، خضاب لگاتے، بھڑکیلے کپڑے پہنتے، غرض اس دورے میں سراپا زندگی، سراپا نشاط، اور سراپا باغ و بہار بن جاتے تھے، اس دورے میں سید صاحب مرحوم ان کو دیکھکر فرمایا کرتے تھے

ع ان دنوں جوشِ جنوں ہے مرے دیوانے کو

اس کے مقابلہ میں دوسرا قنوطی دورہ ہوتا تھا، اس میں دل و دماغ پر غمناک خیالات کا ہجوم ہو جاتا تھا، ہر چیز میں یاس و ناامیدی نظر آتی تھی، ہر وقت افسردہ اور غمگین رہتے تھے، حال و مستقبل سب تاریک نظر آتا، ماضی پر بڑا تاسف پیدا ہو جاتا مستقبل بالکل تاریک نظر آتا، ہر وقت اپنی اور اہل و عیال کی تباہی کے وہم سے پریشان رہتے تھے، لکھنا پڑھنا بالکل چھوٹ جاتا، رات دن پلنگ پر بالکل خاموش پڑے رہتے اور جب بولتے تو اپنی پریشانیوں اور مستقبل کے خطرات کا رونا روتے، اور اپنی داستان سنا کر ہر شخص سے ہمدردی کے طالب ہوتے۔



ان دونوں دوروں میں ان کو اپنی کسی چیز پر قابو نہ رہ جاتا تھا، اور ان کے رفیقوں کو ان کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا، اس مرض کا اثر ان کی پوری زندگی پر تھا،

طبعاً بڑے سادہ مزاج بلکہ بھولے تھے، جو لوگ ان کی تصانیف کے ذریعہ ان کو جانتے تھے وہ ان سے ملنے کے بعد اس کا یقین ہی نہیں کر سکتے تھے کہ وہ ان کتابوں کے مصنف ہو سکتے ہیں، ان کے خیالات اور عمل کی دنیا بڑی محدود تھی، اس کے باہر وہ بہت کم قدم نکالتے تھے، ذاتی معاملات کے علاوہ ان کو دنیا کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہ تھی، نہ ان پر کبھی غور کرتے تھے اور نہ اس کا اثر لیتے تھے، سیاست سے ان کو کوئی لگاؤ نہ تھا، دنیا کے اہم امور و مسائل پر غور و فکر تو بڑی چیز ہے، وہ موٹے موٹے اور عامۃ الورود معاملات و مسائل کے سوا جن پر آجکل ہر صحبت میں گفتگو ہوتی ہے، دنیا کے حالات سے بالکل بے خبر تھے، حتی کہ دنیا کے جغرافیہ میں وہ صرف ان بڑے ملکوں اور بڑی حکومتوں کے سوا جن کو ایک عامی بھی جانتا ہے، چھوٹے چھوٹے ملکوں اور حکومتوں سے بھی واقف نہ تھے، مختلف چیزوں کے متعلق ایسے ایسے سوالات کرتے تھے، جنکو سنکر ہنسی آتی اور پرانے بھولے بھالے بزرگوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی لیکن جب لکھنے بیٹھتے تو قلم سے موتی ٹپکتے تھے،

اخبار وہ محض بیکاری کے مشغلہ کے طور پر دیکھتے تھے، اور زیادہ "تر سنسنی خیز" پڑھتے تھے، چنانچہ پورا اخبار پڑھ جاتے تھے اور اہم سیاسی خبروں تک سے ناواقف رہتے تھے جب کسی دوسرے کی زبان سے کوئی اہم خبر سنتے تو دوبارہ اخبار کی تلاش ہوتی، سیاسی معاملات پر وہ شہر کی ایک مشہور شخصیت حاجی عبد الغفور خستہ سے جو بالکل ان پڑھ، لیکن دار المصنفین کے بڑے حاضر باش اور دنیا بھر کی خبریں لاتے رہتے ہیں، گفتگو اور تبادلہ خیالات کرتے تھے، اسوقت ان دونوں ماہروں کی گفتگو سننے کے لائق ہوتی تھی،

ان میں بعض متضاد اوصاف تھے، بعض چیزوں میں بڑے قدامت پرست اور بعض میں جدت پسند تھے، جدید تمدن کی اکثر چیزوں کو بہت پسند کرتے تھے اور اس پر حیرت کرتے تھے، لیکن ہندوستان کے اس دور کے کسی آدمی کی بڑائی کے قائل نہ تھے، ان کے نزدیک بڑائی سر سید، محسن الملک، وقار الملک، مولانا شبلی، آغا خاں، تلک، گوکھلے، سر سریندر ناتھ بنرجی اور گاندھی جی اور ان کے معاصرین پر ختم ہوگئی تھی، یہی رائے علماء کے طبقہ اور علم کے متعلق بھی تھی، علم ان کے نزدیک پرانے یا زیادہ سے زیادہ ان کے دور کے علماء پر ختم ہوگیا تھا، اور اب کوئی علمی کام کرنے کے لیے باقی نہ رہ گیا تھا، بعض پرانے طرز کے علماء کے متعلق بڑی دلچسپ اور ظریفانہ رائیں رکھتے تھے، اور ان پر بڑی دلچسپ تنقید کرتے تھے مگر اکابر میں حضرت مولانا اشرف علیؒ کے بہت قائل تھے

مگر اسی کے ساتھ دوسرا پہلو یہ تھا کہ ہر بڑے اور صاحب وجاہت آدمی کو خواہ رئیس ہو، بڑا عہدہ دار ہو، لیڈر ہو بڑی ہیبت کی نظر سے دیکھتے تھے، جب تک وہ خود ملنے میں پیشقدمی نہ کرتا تھا، اس کے قریب جانے کی ہمت نہ کرتے، بلکہ دور سے بچوں کی طرح جھانکتے، امراء اور رؤسا کے عیش و تنعم اور شان و شوکت کے واقعات بڑے شوق، دلچسپی اور حیرت کے ساتھ سنتے تھے، اور کبھی کبھی خود نواب علی حسن خاں، منشی احتشام علی، حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم کی امارت کے واقعات بیان کیا کرتے تھے جن کو سنکر ہنسی آتی تھی، نواب رامپور اور نظام حیدر آباد کے واقعات سنکر تو ان پر ایسی مسرت آمیز حیرت طاری ہوتی تھی، کہ معلوم ہوتا تھا الف لیلہ کی کسی محفل میں پہنچ گئے ہیں، انگریزی تمدن اور انگریزی حکومت کی شان و شوکت کی بنا پر انگریزوں کے بڑے مداح تھے، اور حکمرانی انگریزوں پر ختم سمجھتے، ان کے نزدیک ہندوستان و پاکستان کسی میں بھی حکومت کی اہلیت نہ تھی، ان کے ذہن میں آزادی اور غلامی کا اس کے علاوہ کوئی مفہوم نہ تھا کہ جس حکومت میں حسن انتظام شان و شوکت، امن و امان اور خوشحالی ہو،



وہی اصلی حکومت ہے ورنہ حکومت نہیں بنیایت ہے، طبعاً بڑے کمزور تھے، خطرات کے قریب نہ جاتے تھے، مگر بے خطر اور پُرامن ہنگاموں سے بڑی دلچسپی تھی، چنانچہ میلوں میں بڑے شوق سے شریک ہوتے تھے، اور اس دن گھر کے بجائے میلہ ہی کی چٹپٹی چیزیں کھاتے تھے اور کبھی کبھی ہم لوگوں کے لیے بھی خرید لاتے تھے۔

ان پر اکثر خود فراموشی طاری رہتی تھی، اس لیے سوسائٹی کے ظاہری آداب و رسوم کے پابند نہ تھے، کبھی جب موڈ میں ہوتے تو سارے آداب برتتے۔ نہایت عمدہ باتیں کرتے، ملنے والا سمجھتا کہ وہ واقعی مشہور مصنف مولانا عبدالسلام صاحب سے مل رہا ہے، اور کبھی دماغ بالکل غیر حاضر رہتا، مخاطب کرنے پر بھی "اوں" کے علاوہ کوئی جواب نہ دیتے، باتیں کرتے کرتے بالکل غائب ہو جاتے، یا ایسی باتیں کرتے کہ سننے والا حیرت سے منہ تکنے لگتا یا دفعۃً اٹھکر چل دیتے، ان کے اس جذب کی بنا پر سید صاحب ان کو "بت بے پیر" فرمایا کرتے تھے اور اگر کوئی ان کو زیادہ چھیڑتا تو فرماتے

لوگ پتھر سے نہ ماریں مرے دیوانے کو

مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوری ان کو مجذوب کہتے تھے، اور ان کے بھولے پن سے بڑا لطف لیتے تھے، ان کی سادگی، بھولے پن اور خود فراموشی کے بڑے دلچسپ واقعات ہیں مگر ان کی تفصیل تطویل کا باعث ہوگی، اس لیے ان کو قلم انداز کیا جاتا ہے۔

ان کے بعض خاص اصول و معمولات تھے، تین چار میل روزانہ شام کو ٹہلتے تھے، مگر کھلی فضا کے بجائے بازار اور آبادی میں ٹہلنا زیادہ پسند تھا اس معمول میں تنوطی دورے کے علاوہ کبھی فرق نہ آتا تھا، مگر اس کی تلافی رجائی دورے میں ہوتی تھی، اس میں ان کی سیر و تفریح بہت بڑھ جاتی، شام کے علاوہ صبح اور کبھی کبھی دوپہر کو بھی نکل جاتے تھے اور اس کے لیے بہانے

ڈھونڈھتے تھے، بازار کے سارے کام خود انجام دیتے تھے، اس میں ملازموں پر اعتماد نہ تھا، ذاتی
ضروریات کی چیزیں خود خریدتے تھے، درزی کو کپڑا خود لیجا کر دیتے تھے، اور سلنے کے بعد خود ہی لاتے تھے،
ڈاک خانہ میں خود روپیہ جمع کرتے تھے، اور خود ہی نکالتے تھے، حتیٰ کہ خط بھی اپنے ہاتھ سے چھوڑتے تھے،
جاڑا ان کے لیے نہایت تکلیف دہ موسم تھا، اس سے بہت گھبراتے تھے، اور اس کے لیے
بڑا اہتمام کرتے تھے، ہر سال نئی جڑاول بنواتے تھے، دن بھر اوڑھے لپیٹے رہتے تھے، اس کے باوجود
ان کی سردی نجاتی تھی، گرمی بہت پسند تھی، اس موسم میں بہت بشاش رہتے تھے، کتنی ہی شدید
گرمی ہو، اس کی شکایت نہ کرتے تھے، اور نہ ٹھنڈک کا کوئی انتظام کرتے تھے، حتیٰ کہ پنکھا تک استعمال
نہ کرتے تھے، لو کے تھپیڑے ان کے لیے نسیم سحر سے زیادہ خوشگوار تھے، گرمیوں میں بھی رات کو
رضائی اوڑھتے تھے، کپڑا معمولی قیمت کا بھڑکدار پسند تھا، گرمیوں میں بڑے بوٹوں کی چکن یا شوخ
پھولدار کپڑے کی شیروانی پہنتے تھے، اور جاڑے میں کشمیرے یا چھینٹ کی، استعمال کرتے تھے، مگر
قمیص ہمیشہ موٹی پہنتے تھے، مہین کرتہ پسند نہ تھا، جاڑوں میں اونی چادر سر سے لپیٹے رہتے تھے،
جس میں منہ بھی چھپ جاتا تھا، رضائی بھڑکیلی شوخ رنگ کی ہوتی تھی، جاڑوں میں پائجامہ اونی
استعمال کرتے تھے اور ایک ہی پائجامے میں پورا جاڑا گذار دیتے تھے، جو کثرت استعمال سے کبھی کبھی
اسقدر گھس جاتا تھا کہ صرف تانا بانا رہ جاتا تھا، اکثر ایسے پھولدار اور شوخ رنگ کے کپڑے بنواتے
کہ اس زمانہ کے بچے بھی اس کو استعمال کرنا پسند نہیں کرتے، اگر کوئی شخص ٹوکتا تو جواب دیتے
تم بدمذاق ہو کپڑا وہی ہے جو دوسروں کی نگاہ میں آئے۔

کھانے پینے میں چٹپٹی چیزیں زیادہ مرغوب تھیں، بازار کے کباب اور چاٹ بہت پسند کرتے
تھے، اور کبھی کبھی اس قسم کی چیزیں بازار جا کر کھاتے تھے، چائے عمر بھر استعمال کی مگر اس کے عادی
مطلق نہ ہوئے، اگر وقت پر ان کو چائے نہ ملتی تو ان کو کوئی تلاش نہ ہوتی، پانی ہر موسم میں



ٹھنڈا پسند تھا، جاڑوں میں بھی باسی پانی پیتے تھے، پھلوں میں امرود بڑے شوق سے کھاتے تھے۔

مراق اور ریاح بواسیر کی شکایت کے سوا ان کی عام صحت بہت اچھی تھی، بہت کم بیمار
پڑتے تھے، اور بیماری بھی بہت معمولی ہوتی تھی، بیماری میں علاج کے قائل نہ تھے، معمولی نزلہ زکام کو
تو وہ خاطر میں بھی نہ لاتے تھے، اور نہ کوئی پرہیز کرتے تھے، اس عمر میں بھی معدہ صحیح اور غذا اچھی تھی،
اور کھانے پینے میں کوئی احتیاط نہ کرتے تھے، چار پانچ میل آسانی سے چل لیتے تھے، مگر مراق کے دورے
کے زمانہ میں ان پر بیماری اور موت کا بڑا ہراس طاری ہو جاتا تھا، اس زمانہ میں وہ موہومہ خطرات
کے مقابلہ اور بیماری و موت کے لیے روپیہ جمع کرتے تھے، میں کہا کرتا تھا کہ آخر موت کے لیے اتنے
انتظامات کی کیا ضرورت ہے، کیا اس کے لیے بھی دھوم دھام کی ضرورت ہوگی، جواب دیتے کہ
اگر میں بے کار ہو گیا تو کیا ہوگا، یہ عجیب اتفاق ہے کہ انکو موت اس وقت آئی جب ان پر زندگی
ہی زندگی برستی تھی، اور ان کے علاج میں ایک حبہ بھی صرف ہونے کی نوبت نہ آئی، انتقال کے
کئی مہینے پیشتر سے ان پر نشاط کا دورہ تھا، ہر وقت شاداں و فرحاں رہتے تھے، ان کی وفات سے
کچھ پہلے اعظم گڈھ میں بڑی طوفانی بارش ہوئی تھی، اس میں وہ گھومنے نکل جاتے تھے، اگر ٹوکا جاتا
تو جواب دیتے کہ اس موسم سے لطف اٹھانے کا یہی طریقہ ہے، سفر سے بہت گھبراتے تھے، مگر اس
دورے میں سفر کا شوق بھی پیدا ہو گیا، اور اپنے پرانے رفیق مولانا ابو الکلام سے ملنے کے لیے دلی
جانے والے تھے، راستہ میں لکھنؤ اور دلی ٹھہرنے کا بھی ارادہ تھا، اس کے لیے کئی مہینے سے بڑی
تیاریاں کر رہے تھے، ہر جگہ کے لیے مع شیروانی اور جوتے کے الگ الگ جوڑے بنوائے تھے معلوم
ہوتا تھا کہ لندن کے سفر کی تیاریاں ہیں، خط لکھ کر مولانا ابو الکلام سے سفر کی تاریخ بھی طے کر چکے
تھے، کہ عین اس حالت میں سفر آخرت پیش آگیا، اور یہ حادثہ ایسا آناً فاناً ہوا کہ اس کا وہم و گمان
بھی نہ تھا، بالکل اچھے خاصے تھے، کسی قسم کی کوئی شکایت نہ تھی، ۳ر اکتوبر ۵۶ء کو سارے معمولات

پورے کیے، حتی کہ سہ پہر کو شہر گھومنے گئے، رات کا کھانا کھا کر اچھے بھلے سونے کے لیے لیٹے، ۲ بجے شب کو استنجے کے لیے اٹھے، غسلخانہ سے پانی لیا، غسلخانہ سے نکلتے ہی قلب کا دورہ پڑ گیا، لوٹا ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا، میں قریب ہی سویا ہوا تھا، مجھے آواز دی، میں اٹھا تو وہ زمین پر بیٹھے ہوئے تھے، میں نے پوچھا خیریت ہے، کیسا مزاج ہے، فرمایا میرے پاؤں جواب دے رہے ہیں اور تنفس ہو رہا ہے، میں نے پکڑ کر تخت پر جو قریب ہی بچھا ہوا تھا بٹھایا، کہا مجھ سے بیٹھا نہیں جاتا لٹا دو، میں نے برآمدہ سے لیجا کر اپنے کمرہ میں پلنگ پر لٹا دیا، مجھے صورت حال کی نزاکت کا مطلق اندازہ نہ ہوا، میں سمجھا کہ جس طرح کبھی کبھی چکر آجاتا تھا، آگیا ہوگا، تھوڑی دیر میں طبیعت سنبھل جائے گی، مگر ان کا وقت پورا ہو چکا تھا، پلنگ پر لٹاتے ہی دو چار لمبی سانسیں لیں اور ختم ہو گئے، دار المصنفین کے احاطہ کے لوگ بھی اس وقت پہنچے جب وہ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔

اپنی نیکی، بے نفسی اور سادگی اور بے تکلفی کی وجہ سے ہر طبقہ میں یکساں مقبول تھے، لوگ انکی عزت ہی نہیں، ان سے محبت کرتے تھے، اس لیے ان کی موت کا عوام و خواص دونوں یکساں متاثر ہوئے بلکہ غربا، اور عوام زیادہ متاثر ہوئے عموماً بڑے لوگوں کا غم بڑے طبقہ تک محدود رہتا ہے، اور وہ بھی حقیقی سے زیادہ رسمی ہوتا ہے، غربا، اور عوام کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی، موت درحقیقت وہی ہے جس پر غریب اور دردمند طبقہ کی آنکھیں اشکبار ہو جائیں، اس اعتبار سے مولانا کی موت بڑے آدمیوں کی موت سے بڑھ کر تھی، ان کی موت پر غریبوں کی آنکھیں اشکبار تھیں، ان کی وفات پر بہت سے تعزیتی خطوط آئے، مگر سب سے زیادہ موثر تعزیت ادنیٰ طبقہ کے ایک غریب شخص کی تھی، اس نے کہا "مولوی صاحب بڑے بھلے مانس رہیں، اب بنگلوا (دار المصنفین) کھالی ہوے گوا۔" اس کا یہ تاثر بالکل صحیح تھا، اس لیے کہ اب واقعی دار المصنفین میں اس طبقہ سے انسانیت اور ہمدردی کا برتاؤ کرنے والا کوئی نہ رہ گیا تھا، ان کی یہ مقبولیت انشاء اللہ عالم آخرت میں ان کی مقبولیت



کا ذریعہ ہوگی،

ان میں بعض اوصاف ایسے تھے کہ اس زمانہ میں ناپید ہیں، آجکل کتنے تسبیح و مصلّی والے ایسے ہیں جن کا دامن حقوق العباد سے پاک و معاملات میں صاف ہو اور جن سے کسی انسان کو ایذا نہ پہنچی ہو، مولانا عبد السلام صاحب کا دامن ان تمام معاملات میں معصوم بچوں کی طرح بے داغ تھا انکے ذمہ کسی کا ادنیٰ حق بھی نہ تھا، بلکہ اپنی حق تلفی پر بھی وہ خاموش رہتے تھے، ان کی ذات سے کسی کو ادنیٰ تکلیف بھی نہیں پہنچی، یہ معمولی بات نہیں ہے، اس زمانہ میں اس کی مثالیں کم ملیں گی انکے مضامین اور ان کی مذہبی کتابوں سے بہتیرے مسلمانوں کو ہدایت حاصل ہوئی اسلئے انشاء اللہ ان کے یہ نیک اعمال رائیگاں نہ جائیں گے، باقی بشری کمزوریوں سے کوئی انسان بھی مستثنیٰ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے، امید ہے کہ وہ ان الحسنات یذھبن السیات کے اصول پر ان کی نیکیوں کے طفیل میں ان کی کمزوریوں سے درگذر فرمائے گا،

وہ اگرچہ ضعف پیری کی وجہ سے کئی سال سے کام کے لائق نہ رہ گئے تھے مگر انکی موجودگی ہی سے ایک علمی وزن تھا، اور علمی مشکلات میں ان سے بڑی مدد ملتی تھی، اب کوئی شخص ایسا نہیں رہ گیا جس پر اعتماد کیا جا سکے اور جس کی جانب رجوع کیا جا سکے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

---

## حکمائے اسلام

(جلد دوم)

یہ سلسلۂ حکمائے اسلام کی دوسری جلد ہے، اس میں ابن باجہ، ابن طفیل ابن رشد، امام رازی، مغلوں اور تاریوں کے عہد کے حکما، خاندان فرنگی محل، خاندان خیرآباد اور دوسرے خاندانوں کے حکما و فلاسفہ کے حالات ہیں اور انھوں نے فلسفہ و حکمت کے ذریعہ اسلام کی جو خدمات انجام دیں اسکی تفصیل ہے۔

مولفہ مولانا عبد السلام ندوی، قیمت ۔ روپے

منیجر

# دیوان حافظ میں الحاق

از جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب، لکھنؤ یونیورسٹی

دیوان حافظ میں الحاق — یوں تو اگر زیادہ تفحص و تحقیق سے کام لیا جائے تو شاید ہی کوئی شاعر یا ادیب ایسا ملے گا جس کا کلام الحاق سے پاک ہو، لیکن حافظ کے کلام میں جتنا الحاق ہے اس کا حصر و اندازہ تقریباً محال ہے، علامہ مرزا محمد قزوینی[1] نے بالکل صحیح لکھا ہے:

در دنیا، ہیچ دو نسخہ از دیوان حافظ بایکدیگر مطابقت ندارند نہ در متن اشعار یعنی در سوق عبارات و جمل و کلمات و نہ در عدۂ غزلیات یا ابیات ہر غزلی و بعبارۃ اخری نہ در کمیت اشعار و نہ در کیفیت آنہا، و ایں اختلاف نسخ در مورد دیوان خواجہ بخصوص فی الواقع بحدی است کہ شخص متتبع را کہ غرض او فقط مطالعہ و تمتع از اشعار خود خواجہ باشد نہ اشعار الحاقی دیگراں کہ بتدریج عدۂ زیادی از آنہا در دیوان خواجہ داخل شدہ یا اشعاری کہ گرچہ در اصل از خود خواجہ بودہ ولی بعدہا بمرور ایام در نتیجۂ تصرفات بے حد و شمار نساخ از صورت اصلی تغییر یافتہ و دگرگوں شدہ بکلی عاجز متحیر و سرگرداں میکنند"

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ خواجہ حافظ کے دیوان کے الحاق کی تین صورتیں ہیں:

(۱) خواجہ کے اشعار مرور ایام کے ساتھ محرف ہو گئے، کاتبوں کے لیے حافظ کے زمانے

---

[1] دیوان حافظ باہتمام مرزا محمد و دکتر قاسم غنی، مقدمہ ص "کو"۔ یہ دیوان ۱۸ نسخوں کی مدد سے ۱۳۲۳ شمسی میں کتاب فروشی زوار کی طرف سے شائع ہوا، دیوان ظاہری اور باطنی خوبیوں سے آراستہ اور قابل دید ہے۔



کے بعض کلمے اور اصطلاحیں ناقابل فہم ہو گئی تھیں، جن کو انھوں نے مانوس لفظوں سے تبدیل کر دیا؛

حافظ کی شہرت ان کے زمانے میں جس قدر تھی، اس سے کہیں زیادہ زمانۂ مابعد میں ہوئی، اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا یہ شہرت عالمگیر ہوتی گئی، اور عالم و جاہل، عارف و عامی، وضیع و شریف ہر طبقہ میں ان کا کلام حد سے زیادہ مقبول ہوا، اس کے نتیجے میں ان کے دیوان کے ہزاروں نسخے طبع و مشتہر ہوئے، اس لیے قدیم زمانے سے لیکر اس وقت تک مستقلاً اس میں طرح طرح کے تصرفات ہوتے رہے، شاعر کی زبان اور نساخ کی زبان میں فرق ہونے کی بنا پر کاتبوں نے "تغیرات و تبدیلات"، "اصلاحات" و "تصحیحات" سے کام لیا، اور صرف کاتبوں اور نساخوں سے یہ "عمل" میں نہیں آیا بلکہ مطالعہ کرنے والوں نے بھی حقِ مطالعہ ادا کیا، اپنی عقل و فہم کے مطابق جو کلمے اور فقرے ان کی سمجھ میں نہیں آئے، ان کو تبدیل کر دیا، چنانچہ حافظ کے قدیم و جدید نسخوں کے مقابلہ سے یہ بات پوری طرح ظاہر ہو جاتی ہے کہ قدیم نسخوں میں جو غیر مفہوم و غیر مانوس کلمے پائے جاتے ہیں، وہ جدید نسخوں میں متداول و مفہوم کلموں سے تبدیل ہو گئے ہیں، یہ عمل صرف دیوان حافظ تک محدود نہیں، بلکہ سارے متون قدیمہ میں ہوا، خصوصاً جو متون جس قدر زیادہ مقبول اور ادبی شاہکار متصور ہوئے ہیں، ان میں بجا و بیجا اسی قدر تصرفات ہوئے ہیں، حافظ کے دیوان سے اس کی بعض مثالیں[1] پیش کیجاتی ہیں،

نسخ قدیمہ میں ایک بیت اس طرح پائی جاتی ہے،

خوش وقت بوریا و گدائی و خواب امن — کاین عیش نیست درخور اورنگ خسروی

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "خوش وقت بوریا" غیر مفہوم یا غیر مانوس معلوم ہوا، اسلیے اس کو "خوش فرش بوریا" سے تبدیل کر دیا، چنانچہ نسخ جدیدہ میں اس طرح ہے،

---

[1] دیوان حافظ مصححہ مرزا محمد و دکتر قاسم غنی۔

خوش فرش بوریا و گدائی و خواب امن

اسی طرح قدیم نسخوں کی یہ بیت :

دانی کہ چنگ وعود چہ تقریر میکنند — پنہاں خورید بادہ کہ تعزیر میکنند

جدید نسخوں میں اس طرح بدل گئی :

پنہاں خورید بادہ کہ تکفیر می کنند

اس لیے کہ تقریر کے مقابلہ میں تکفیر عام فہم ہے،

اسی طرح ان دو بیتوں میں :

خیز تا خرقۂ صوفی بخرابات بریم — شطح و طامات ببازار خرافات بریم

طامات و شطح در رہ آہنگ چنگ — تسبیح و طیلساں بمی خوشگوار بخش

"شطح" کا لفظ عام فہم نہ تھا، اس لیے جدید نسخوں میں اسے "زرق" سے تبدیل کر دیا گیا ہے،

یا اس بیت میں

یار دلدار من از قلب بدینساں شکند — ببرد زود بجانداری خود پادشہش

کلمہ "جانداری" پوری طرح سمجھ میں نہیں آیا، اس لیے ناسخوں نے اسے "سرداری" سے بدل دیا ہے،

اس بیت میں

زہد رندان نو آموختہ راہی بہیست — من کہ بدنام جہانم چہ صلاح اندیشم

قدیم نسخوں میں "بہ ہیست" ہے، چونکہ ناسخ کو "راہی بہ ہیست" نامانوس معلوم ہوا اس لیے اس نے اسے "راہی بہ نیست" سے بدل دیا،

اسی طرح کے تصرفات سے سارا دیوان بھرا پڑا ہے۔

(۲) دوسری تحریف یہ ہوتی ہے کہ کسی شاعر کی غیر معمولی شہرت اور اس کے دیوان کے



بکثرت منتشر ہونے کی بنا پر اس میں دوسرے شاعروں کے کلام کے داخل ہونے کا موقع زیادہ ہو جاتا ہے، اس کی بہت سی صورتیں ہوتی ہیں، کبھی غیر معمولی شہرت کی بنا پر دوسروں کے اشعار اس کی طرف منسوب ہو جاتے ہیں، کبھی دو شاعروں کی ہم ردیف و قافیہ غزلیں ایک دوسرے کے دیوان میں شامل ہو جاتی ہیں، دیوان حافظ میں اس طرح کے الحاق کی مثالیں بھی کثرت[1] سے ملتی ہیں،

حافظ کی ایک مشہور غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے :

رونق عہد شباب است دگر بستاں را — میرسد مژدۂ گل بلبلِ خوش الحاں را

اسی زمین میں سعدی کی بھی غزل ہے، اس کا یہ شعر حافظ کی غزل میں شامل ہو گیا،

ملک آزادگی کنج قناعت گنجیست — کہ بشمشیر میسر نشود سلطاں را

یا سعدی کا یہ مشہور شعر

باز آکہ در فراقِ تو چشمِ امیدوار — چوں گوشِ روزہ دار بر اللہ اکبر است

حافظ کی اس غزل کے ساتھ ملحق ہے :

باغ مرا چہ حاجتِ سرو و صنوبر است — شمشاد خانہ پرور ما از کہ کمتر است

یا مثلاً سعدی کے دو مصرعے حافظ کی ان دو بیتوں میں پائے جاتے ہیں :

سر پیوند تو تنہا نہ دل حافظ راست — کیست آنکس سر پیوند تو در خاطر نیست

بگذار تا ز شارعِ میخانہ بگذریم — کز بہر جرعۂ ہمہ محتاج این دریم

امکان اس کا بھی ہے کہ حافظ نے پہلی غزل کے مقطع میں اور دوسری غزل کے مطلع میں

---

[1] یہ مثالیں دیوان حافظ مرتبۂ خلخالی (دیباچہ ص کر - کو - کز) سے ماخوذ ہیں۔ خلخالی نے سنہ ۸۲۷ھ کے لکھے ہوئے نسخے سے مرتب کیا ہے، اور یہ سب سے قدیم نسخہ ہے جو ابھی تک دریافت ہوا ہے، اس نسخے کی اشاعت نے حافظ کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں بڑی سہولت پیدا کی ہے، سنہ ۱۳۰۶ شمسی میں طہران سے شائع ہوا ہے،

(پہلے مصرع) سعدی کے مصرعوں پر تضمین کی ہو، کیونکہ قدیم نسخوں[۱] میں بھی دو مصرعے موجود ہیں۔

یا مثلاً یہ دونوں غزلیں جن کے حسب ذیل مطلعے و مقطعے حافظ کے قدیم دیوان میں تو نہیں

لیکن جدید نسخوں میں پائے جاتے ہیں اور یہی غزلیں خواجہ کے قدیم نسخے میں (خصوصاً وہ نسخہ جو ۸۲۹ھ[۲] کا لکھا ہوا ہے) پائی جاتی ہیں، اس لیے وہ خواجہ ہی کی ملکیت قرار پائیں گی:

چو جام لعل تو نوشم کجا بماند ہوش | چو چشم مست تو بینم مرا کہ دارد گوش
مرا چو خلعت سلطان عشق میدادند | ندا زدند کہ خواجو خموش باش خموش

روز عیش و طرب ماہ صیام است امروز | کام دل حاصل و ایام بکام است امروز
گو بگویند کہ در دیر مغان خواجو را | دست در گردن و لب بر لب جام است امروز

حسب ذیل تین غزلیں جنکے مطلعے و مقطعے درج ہیں حافظ کے قدیم نسخوں میں نہیں ہیں، اور سلمان ساؤجی کے خطی نسخے میں جو نویں صدی ہجری کا ہے، موجود ہیں، اس لیے ان کو حافظ کے جدید دیوان میں الحاقی سمجھنا چاہیے،

زباغ وصل تو جوید ریاض رضوان آب | زتاب ہجر تو دارد شرار دوزخ تاب
مرا بد ر رخت شد یقین کہ جوہر لعل | پدید میشود از آفتاب عالم تاب

زلفین سیہ خم بخم اندر زدہ باز | وقت من شوریدہ بہم برزدہ باز
شبہا زغمت راست کبوتر دل سلمان | دریاب کہ بر صید کبوتر زدہ باز

میکشم ہر نفس از دست فراقت فریاد | آہ اگر نالہ زارم نرساند بتو باد
در از آں کم نشود نالہ سوزم باری | بیم آنست کہ سیلاب رود در بغداد

آقائے ملک الشعراء بہار[۳] اس غزل کو بھی سلمان کی طرف منسوب کرتے تھے،

---

[۱] دیوان خ غزل نمبر ۷۰، ۹۱، ۳۱۹ [۲] ملاحظہ ہو حاشیہ نسخہ خ ص کر [۳] دیوان خ دیباچہ ص "کو" حاشیہ نمبر ۲



گفتم کہ خطا کردی و تدبیر نہ این بود

حسب ذیل غزل عماد فقیہ کے دیوان مکتوبہ ۹۸۱ھ[۱] میں موجود ہے، اور حافظ کے قدیم نسخوں میں نہیں ہے، اس لیے اس کو حافظ کی ملکیت قرار نہیں دیا جاسکتا،

تا سایۂ مبارکت افتاد بر سرم | دولت غلام من شد و اقبال چاکرم

یہ مشہور غزل جس کا یہ مصرع ہے

لطف باشد گر نپوشی از گدا ہا روے را

حافظ شانہ تراش کی ہے، کیونکہ بقول "سودی"[۲] اس کے سارے اشعار اسی طرح کے صنائع شعری کے حامل ہیں، اور حافظ کے قدیم نسخوں میں نہیں ہے، مگر جدید نسخوں میں ہے

حسب ذیل غزل بھی حافظ کی نہیں بلکہ ملک جہاں خاتون[۳] کی ہے،

غمش تا در دلم ماوا گرفتست | سرم چون زلف او سودا گرفتست
زدریاے دو چشم گوہر اشک | جہان در لؤلؤ لالا گرفتست

اسی طرح یہ مشہور غزل جو حافظ کے قدیم دیوان میں موجود نہیں، عبد المجید[۴] کی ہے،

اگر زکوی تو بوئی بمن رساند باد | بمژدہ جان جہان را بباد خواہم داد

یہ غزل روح الامین[۵] کی طرف منسوب ہے:-

---

[۱] دیوان خ دیباچہ ص "کو" حاشیہ نمبر ۳ [۲] "سودی" ترکی کا بڑا زبردست عالم گزرا ہے جس نے فارسی و عربی میں بڑا نام پیدا کیا تھا، اس نے حافظ کے دیوان کی ایک بڑی مبسوط شرح لکھی تھی جو ۱۲۵۰ھ میں بولاق مصر سے شائع ہوئی، یہ شرح ۱۰۰۳ھ میں مکمل ہوئی تھی، سودی غالباً پہلا مصنف ہے جس نے دیوان حافظ میں الحاق کی طرف توجہ کی ہے، مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، دیوان مرزا قزوینی دیباچہ ص فو - فز - فح و دیوان خ دیباچہ ص کد - کو [۳] از روئے بیاض ملوکرا آقائے نفیسی [۴] ایضاً [۵] ایضاً

گفتند خلایق کہ توئی یوسف ثانی … چو نیک بدیدم بحقیقت بہ از انی

حسب ذیل غزل[1] امیر خسرو دہلوی کی ہے،

بفراغ دل زمانی نظری بماہروئی … بہ از آں کہ چتر شاہی ہمہ عمر ہای ہوئی

یہ مشہور بیت کمال خجندی کی طرف منسوب ہے:

جانب دلہا نگاہ دار کہ سلطاں … ملک نگیرد اگر سپاہ ندارد

یہ مشہور ساقی نامہ خواجو کرمانی کا ہے:

بتاثیر صبح از طبقہائے نور … بگوش آیدم ہر دم از لفظ حور

ان مشکوک غزلیات و ابیات کے علاوہ بھی جس کو عام طور پر حافظ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، بہت سی غزلیں، قصیدے، ترکیب بند، ترجیع بند، حافظ کے دیوان کے قدیم ترین نسخوں میں نہیں پائے جاتے۔ اس بنا پر ان کی ملکیت بھی مجہول و مشتبہ قرار دیجائے گی،

سید عبد الرحیم[2] خلخالی نے ابیات مشکوک کے سلسلے میں خاتمے میں لکھا ہے:

بیش ازیں دریں موضوع اطالۂ کلام را مسزا ندانستہ ابیاتی چند از اساتید غزل کہ از حیث وزن و قافیہ تا حدی از حیث مضمون نیز با یکدیگر موافق ہستند و میتواں گفت کہ اقتباس از یکدیگر کردہ یا توارد است شروع میکنم و اگر صاحبان ذوق و دانشمندان توجہ فرمایند تصدیق خواہند کرد کہ ہمیں توافق وزن و قافیہ در اشعار شعرا موجب ایں ہمہ اختلافات و اشتباہات شدہ کہ امروز تمیز و تشخیص را مشکل کردہ است۔"

اس کے بعد حافظ کی ۵۳ غزلوں کے مطلعے لکھے[3] ہیں اور ساتھ ہی سعدی، خواجو، عماد، رضی سمرقندی، سلمان، جلال، میر کرمانی، عبید زاکان، عبد المجید، سید عضدالدین، شمس الدین محمود،

[1] دیوان امیر خسرو کے ایک قدیمی قلمی نسخے میں یہ غزل مع تخلص کے شامل ہو (حاشیہ دیوان خ ص کز) [2] دیباچہ ص کز [3] ایضاً ص کج، کد، ل، لا، لب، لج، لد، لہ



شیخ جنید، جہاں ملک خاتون، ظہیر فاریابی، روح الامین، عراقی، عتیقی، شہاب الدین، نزاری، افتخار دامغانی، کی ہموزن و ہم ردیف و قافیہ غزلوں کے مطلعے بھی درج کر دیئے[1] ہیں،

(۳) صفوی عہد میں جب مذہبی تعصب و تنگ نظری کا غلبہ ہوا تو شاہ اسمٰعیل صفوی نے خواجہ حافظ کی قبر کی تخریب کا ارادہ کیا، اس وقت حافظ کے بعض بہی خواہوں نے حافظ کے دیوان میں ایسی نظموں کا اضافہ کر دیا جس سے حافظ کا تشیع پوری طرح ثابت ہو جائے، مرزا محمد قزوینی نے کئی جگہ اس[2] کی طرف اشارہ کیا ہے،

با وجود اینکہ ایں قصیدہ و ایں غزل از بہترین اشعار نیست مع ذالک برای نجات اخروی خواجہ باید آرزو کرد کہ ہر دو از خواجہ باشد و الحاقی از بعضے ہوا خواہان خواجہ در عصر صفویہ برای نجات دادن مقبرۂ او از تخریب متعصبین شیعہ نباشد،

ایک دوسری[3] جگہ لکھتے ہیں:

بدون شک الحاقی می باشد از متاخرین در عہد صفویہ بقصد اینکہ خواجہ را نظر بعضے مصالح شیعہ قلمداد کنند۔"

یا ڈاکٹر محمد معین "حافظ شیریں سخن[4]" میں رقمطراز ہیں:

وہمیں غزل بقول مولفان مجالس المومنین و زینۃ التواریخ و لطیفۂ غیبیہ باعث آں شد کہ شاہ اسمٰعیل قبر خواجہ را تخریب نماید۔"

اس مصلحتی الحاق کا یہ نتیجہ ہوا کہ متعدد غزلیں اور قصیدے حافظ کے دیوان میں ایسے شامل ہوئے

[1] مرزا محمد قزوینی نے دیباچہ میں بہت سی غلطیوں کی طرف اشارہ کیا ہو جو دیوان خلخالی میں بھی موجود ہیں اور جو کاتبوں کی غفلت، سہو اور طغیان قلم کا نتیجہ ہیں، (ص مح، مسط، ن، تا، تب) [2] دیوان حافظ مرتبہ خلخالی کی تقریظ میں جو بیست مقالہ قزوینی ج ۲ ص ۹۱ تا ۱۰۳ میں مندرج ہو، یہ فقرے ص ۱۰۱ میں ہیں [3] مقدمہ دیوان حافظ ص تفز [4] ص ۳۰

جن میں ایک طرف تو حضرت علیؓ و اہل بیت اطہار سے غیر معمولی عقیدت تھی، تو دوسری طرف خلفاے راشدین پر سب و لعن، لیکن اس طرح کی کوئی نظم قدیم نسخوں میں نہیں پائی جاتی، ذیل میں ان الحاقی چیزوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے،

دیوان حافظ کے دیباچے میں نعت پیغمبر اس بیت پر ختم ہوتی ہے:

مستغرقِ درود و ثنا باد روح شاں  تا روز را فروغ بود شمع را شعاع

اس کے بعد تمام مطبوعہ اور بعض جدید خطی نسخوں میں اس عبارت کا اضافہ ہے:-

خصوصاً امام المشارق والمغارب جامع اصناف حقایق و معارف قائل کلمۂ "انا کلام اللہ الناطق" اسد اللہ الغالب علی ابن طالب۔

شہنشہی کہ سحرگاہ روز فطرت بود  غرض وجود شریفش ز خلقت انسان

مکرمی کہ ز لطف قدیم لم یزلی  حدیث منقبتش گشتہ زیور قرآن

امیر ملک ولایت کہ شد ز مبداء حال  برای مدحت او مستعد بنطق زبان

لیکن قدیم نسخوں میں سے کسی ایک میں اس الحاق کا نام و نشان نہیں، جیسا کہ مرزا محمد نے تصریح[1] کی ہے، اور اس کے الحاقی ہونے کا فیصلہ کر دیا ہے،

ایک الحاقی قصیدے کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

مقدری کہ ز آثار صنع کرد اظہار  سپہر و مہر و مہ و سال و ماہ و لیل و نہار

[1] مقدمہ دیوان ص مز حاشیہ مرزا محمد لکھتے ہیں، در بعضی نسخ خطی جدید و در اغلب نسخ چاپی ... عبارت ذیل را علاوہ دارند ...... ولی در ہیچیک از نسخ قدیم مانند چن و ہندی و ملک و نسخہ آقای رشید یاسمی و نسخہ آقای دبیر خاقان و نسخۂ آقای تقوی شمارہ ۲ بہیچ وجہ من الوجوہ از جملہ مزبور اثری نیست و بدون شک الحاقی باشد الخ



بدوستی نبی و ولی اساس نہاد  جہان و ہر چہ درو ہست خالق جبار

اگر نہ ذات نبی و ولی بُدی مقصود  جہان بکتم عدم رفتی ہمچو اول بار

نوشتہ بر در فردوس کاتبانِ قضا  نبی رسول و ولی عہد حیدر کرار

امام جنی و انسی علی بود کہ علی  ز کلِ خلق فزون است از صغار و کبار

علی امام و علی امین و علی ایمان  علی امین و علی سرور و علی سردار

علی علیم و علی عالم و علی اعلم  علی حکیم و علی حاکم و علی گفتار

بحق دین محمد بخونِ پاک حسین  بحق مردم نیک مہاجر و انصار

ز بعد او حسن ست و حسین مجتبی او  محبی جہل برین کار مومن دیندار

بدشمناں منشین حافظا تو لاکن  نجات خویش طلب کن بجان و جہار بہشت

حرام زادہ و بد فعل و شوم و بے بنیاد  بمدح شاہ جہاں کے کند کجا اقرار

متابعت بمنافق چو میکنی بگذر  زیادہ گفتن نامش ہزار استغفار

یہی وہ قصیدہ ہے جس کے الحاقی ہونے کا فیصلہ مرزا محمد[1] اور خلخالی[2] دونوں کر چکے ہیں، ڈاکٹر محمد معین کے قلم سے یہ فیصلہ[3] اس طرح ہوا ہے،

این قصیدہ بنیانش بسیار سست و در نسخ قدیمہ موجود نیست و بعلاوہ در آخر آن دو بیت این ست ...... از عارفی ہمچو حافظ بسیار بعید است کہ چنین سب و لعن را در اشعار خود وارد کند۔

[1] مرزا محمد نے اس کو بہت سست اور رکیک کہا ہے، ان کی پوری عبارت قصیدہ کے ضمن میں نقل کی جائیگی۔
[2] دیوان خ دیباچہ ص یو [3] حافظ شیریں سخن ص ۳۱۱ - ۳۱۲، اسکے باوجود ڈاکٹر صاحب اس کو حافظ کے قصائد میں شامل کرنے میں تامل نہیں کرتے (ایضاً ص ۳۸۶)

حسب ذیل غزل جو شاہ منصور کی مدح میں واقع ہے، اس کے آخر میں ایک بیت کا اضافہ ہوا ہے؛

جوزا سحر نہاد حمائل برابرم | یعنی غلام شاہم و سوگند میخورم
حافظ زجاں محب رسول ست و آل او | بر ایں سخن گواست خداوند اکبرم

اس غزل میں حسب ذیل بیت سے غالباً کاتب کو سخت دھوکا ہوا، اور اس نے اس نظم کو حضرت علیؓ کی مدح میں سمجھ کر متذکرہ بالا بیت کا الحاق کر دیا:

دم ہم مزن بوصف زلالِ خضر کہ من | از جام شاہ جرعہ کش حوض کوثرم

حالانکہ اس بیت میں "شاہ" سے مراد شاہ منصور ہے، نہ کہ حضرت علیؓ، جیسا کہ مطلع میں "غلام شاہم" شاہ منصور ہی کے لیے آیا ہے، ڈاکٹر محمد معین[1] بھی اس رائے سے متفق ہیں،

حسب ذیل پوری غزل الحاقی ہے، کسی قدیم نسخے میں نہیں، اگرچہ مرزا محمد جیسے شخص کو اس کے الحاقی ہونے پر افسوس ہے،[2]

ای دل غلام شاہ جہاں باش و شاد باش | پیوستہ در حمایتِ لطفِ الہ باش

"یوسف گم گشتہ" والی غزل میں حسب ذیل بیت الحاقی ہے، کسی قدیم نسخے میں نہیں پائی جاتی، ڈاکٹر محمد معین[3] بھی اس کو الحاقی بتاتے ہیں:

شمع جمع آفرینش شاہ مردانست و بس | گر توئی از جاں غلامِ شاہ مرداں غم مخور

یہ بیت بھی الحاقی ہے، اس لیے کہ کسی قدیم نسخے میں موجود نہیں، علاوہ بریں حافظ کے مسلک صلح کل کے بالکل متضاد ہے،

کجاست صوفی دجال چشم ملحد شکل | بگو بسوز کہ مہدیِ دیں پناہ آمد

---

[1] حافظ شیریں سخن ص ۳۱۲ [2] ان کا قول درج ہو چکا ہے، بیست مقالہ قزوینی ج ۲ ص ۱۰۱،
[3] حافظ شیریں سخن ص ۳۱۲



غرض ان مختلف وجوہ کی بنا پر حافظ کے کلام میں رطب و یابس بہت زیادہ موجود ہے، سید عبد الرحیم خلخالی کو ایک نسخہ ۸۲۷ھ کا لکھا ہوا، یعنی وفات حافظ سے ۳۵ سال بعد کا مل گیا، انھوں نے اس کو شائع کر کے ثابت کر دیا ہے کہ حافظ کی غزلوں کی تعداد کسی صورت میں پانسو سے زیادہ نہیں، لیکن مختلف زمانوں میں ان میں کافی اضافہ ہوتا رہا، چنانچہ تہران[1] کے آخری مطبوعہ نسخوں میں غزلوں کی تعداد آٹھ سو سے زیادہ ہو گئی، مرزا محمد کا یہ قیاس بالکل صحیح ہے کہ جو نسخہ جتنا ہی متقدم ہے، اس میں اسی اعتبار سے اشعار کی تعداد بھی کم ہے، جیسا کہ فہرست ذیل سے صاف طور پر نمایاں ہے:

نسخۂ خطی آقای خلخالی مورخہ ۸۲۷ ۴۹۵ غزل
" جناب آقامی مرأت بظاہر معاصر با نسخۂ اول ۴۸۵ "
" جناب آقای حاج محمد آقا نخجوانی اوائل قرن نہم ۴۹۳ "
" آقای اقبال آشتیانی قرن نہم ۴۸۷ "
" کتابخانہ مجلس شورای ملی مورخہ ۸۵۴ھ ۴۴۰ " قریب
" " " ۸۵۸ھ ۴۹۹ " "
" " " بخط محمد نور داخر قرن نہم ۴۵۳ "
" آقای سید نصر اللہ تقوی بخط سلطان علی مشہدی ۹۰۵ھ ۴۶۸ "
" ہندی متعلق با آقای ڈاکٹر غنی ۴۸۸ "
" کتابخانہ ملی جس کا ایک حصہ بہت قدیم ہے ۴۵۰ "
" " مدرسہ سپہ سالار بخط منعم الدین اوحدی ۹۱۷ھ ۵۱۷ "

---

[1] مقدمہ دیوان مرتبۂ قزوینی ص لز [2] ایضاً ص لج - لد

نسخہ متعلق بکتاب خانہ ملی طہران قرن یازدہم ۵۳۸ غزل

" " باقای رشید یاسمی ظاہرا قرن یازدہم ۵۶۱ "

" " حسین نخجوانی " اواخر " ۵۸۰ "

نسخہ شرح سودی بر حافظ کہ در سنہ ۱۰۰۳ھ تالیف شدی سنہ ۱۲۵۰ھ ۵۷۴ "

" چاپ مصری بولاق (مصر) بحروف نستعلیق سنہ ۱۲۵۶ھ ۵۷۳ "

" " طہران سنہ ۱۲۵۹ھ ۵۹۸ "

" " حکیم پسر وصال در بمبئی سنہ ۱۲۶۷ھ ۵۹۲ "

" " اولیا " سنہ ۱۲۶۸ھ ۵۸۲ "

" " تبریز " ۵۹۱ "

" " تہران سنہ ۱۲۷۵ھ ۵۸۸ "

" " بمبئی بخط مشکیں قلم سنہ ۱۳۰۸ھ ۵۸۷ "

" " تہران سنہ ۱۳۱۴ھ ۵۸۶ "

" " اسلامبول سنہ ۱۳۲۰ھ ۵۶۳ "

" " بمبئی بخط مرزا مہدی شیرازی سنہ ۱۳۲۱ھ ۵۸۵ "

" " بمبئی قدسی سنہ ۱۳۲۲ھ ۵۹۷ "

" " کریمی " ۵۸۴ "

" " لکھنؤ (کشوری) سنہ ۱۳۳۱ھ ۵۸۴ "

" " " سنہ ۱۳۳۴ھ ۵۸۸ "

" " غلخالی تہران سنہ ۱۳۰۷ شمسی ۵۸۹ " اصل معہ ملحقات

---



سید غلخالی نے آخر میں ۵۰ مشکوک غزلوں کو درج کر دیا ہے[1] جو قدیم ترین نسخے میں موجود نہیں ہیں، میں ان غزلوں کے مطلعے ذیل میں درج کرتا ہوں:

ردیف ا ما برفتیم و تو دانی و دل غمخور ما — بخت بد تا بکجا می برد آبشخور ما[2]

تا جمالت عاشقاں راز د بوصل خود صلا — جان و دل افتادہ اند از زلف و خالت در بلا

شب از مطرب کہ دل خوش باد ویرا — شنیدم نالۂ جانسوز نی را

" ب آفتاب از روی او شد در حجاب — سایہ را باشد حجاب از آفتاب

تعالی اللہ چہ دولت دارم امشب — کہ آمد ناگہان دلدارم امشب

صبح دولت میدمد کو جام ہمچوں آفتاب — فرصتی زیں بہ کجا یابم بدہ جام شراب

" ت اگر بلطف بخوانی مزید الطافست — وگر بقہر برانی درون ما صافست

بر و ای زاہد و دعوت مکنم سوی بہشت — کہ خدا در ازل از بہر بہشتم نہ سرشت

مدتی شد کاتش سودای او در جان ماست — زاں تمنا ہا کہ دایم در دل ویران ماست

ہر آں خجستہ نظر کز پی سعادت رفت — بکنج میکدہ و خانۂ ارادت رفت

غمش تا در دلم ما دا گرفتست — سرم چوں زلف او سودا گرفتست

درد اکہ یار در غم و دردم بماند و رفت — ما را چوں دود بر سر آتش نشاند و رفت

نظیر پیر مغاں موجب علیش و طربست — روضۂ میکدہ را آب و ہوای عجب است

دلم ملول گرفت از جہان و ہر چہ در وست — درون خاطر من کس نگنجد الا دوست

حدیث سرو کہ گوید بہ پیش قامت دوست — کہ سر بلندی سرو سہی ز قامت اوست

امروز شاہ انجمن دلبراں یکیست — دلبر اگر ہزار بود دلبر آن یکیست

ساقیم خضر است و می آب حیات — توبہ از می چوں کنم ہیہات ہات

---

[1] ص ۹ تا ۴۳ [2] لطف باشد گر نپوشی از گدا ما روت را ۔ یا ۔ تا بکام دل نہ بیند دیدۂ ما روت ما
یہ غزل حافظ تشنہ تراش کی ہے۔

مارا ز آرزوی تو پروای خواب نیست — بی روی دلفریب تو بودن صواب نیست

ردیف ث — الغیاث ای مایۂ جان الغیاث — کفر زلفت برد ایمان الغیاث

بازم هوای آن گل رعناست الغیاث — دایم دلم رمیده و شیداست الغیاث

ج — آتش اندر آب افسرست یا می در زجاج — یا درخشان درمیان چشمۂ حیوان زجاج

ح — ببین هلال محرم بخواه ساغر راح — که ماه امن و امانست و سال صلح و صلاح

د — در هر هوا که جز برق اندر طلب نباشد — گر خرمنی بسوزد چندان عجب نباشد

مرا می دگر باره از دست برد — بمن باز بنمود می دستبرد

مژده ای دل که مسیحانفسی می آید — که ز انفاس خوشش بوی کسی می آید

آنرا که جام صافی صهباش میدهند — میدان که در حریم حرم جاش میدهند

دل شوق لبت مدام دارد — یارب ز لبت چه کام دارد

من و صلاح و سلامت کس این گمان نبرد — که کس برند خرابات ظن آن نبرد

صورت خوبت نگارا خویش بآئین بسته اند — گوئیا نقش لبت از جان شیرین بسته اند

بوی مشک ختن از باد صبا می آید — این چه باد است کز بوی شمامی آید

تنم ز رنج فراوان دمی نیاساید — دلم ز اندۂ بیحد همی بفرساید

گفتم که خطا کردی و تدبیر نه این بود — گفتا چه توان کرد که تقدیر چنین بود

ترک من چون جعد مشکین گرد کاکل بشکند — لاله را دل خون شود بازار سنبل بشکند

عشقت نه سرسریست که از سر بدر شود — مهرت نه عارضیست که جای دگر شود

اگر خدای کسی را ببر گناه بگیرد — زمین بناله درآید زمانه آه بگیرد

سر سودای تو اندر سر ما میگردد — بین که اندر سر شوریده چها میگردد



میزنم هر نفس از دست فراقت فریاد — آه اگر نالۂ زارم نرساند بتو باد

مرا بوصل تو گر زانکه دسترس باشد — دگر ز طالع خویشم چه ملتمس باشد

هوس باد بهارم بسوی صحرا برد — باد بوی تو بیاورد و قرار از ما برد

ز دل برآمدم و کار بر نمی آید — ز خود بدر شدم و یار در نمی آید

ساقی اندر قدحم بازمی گلگون کرد — در می کهنۂ دیرینۂ ما افیون کرد

اگر ز کوی تو بوئی بمن رساند باد — بمژده جان جهان را بباد خواهم داد

دلم بجمالت صفائی ندارد — چو بیگانۂ کاشنائی ندارد

ردیف ر — دلا چند بریزی ز دیده شبنم دار آخر — تو نیز ای دیده خوابی کن مراد دل برآر آخر

ساقیا مایۂ شباب بیار — یکدو ساغر شراب ناب بیار

سرو بالا بلند خوش رفتار — دلبر نازنین گل رخسار

ز — خوش آن سنبل که درآئی بصد کرشمه و ناز — کنی تو ناز بشوخی و من کشم بنیاز

براه میکده عشاق راست در تگ و تاز — همان نیاز که حجاج را براه حجاز

صبا به مقدم گل راح روح بخشد باز — کجاست بلبل خوشگو برآورد آواز

س — جانا ترا که گفت که احوال ما مپرس — بیگانه گرد و قصۂ هیچ آشنا مپرس

ش — بجد و جهد چه کاری نمیرود از پیش — بجمه دگار رها کردۂ مصالح خویش

بس خرابم ز غم یار خراباتی خویش — میزند غمزۂ او ناوک غم بر دل ریش

ای دل بغم شاه جهان باش شاد باش — پیوسته در حمایت لطف اله باش

ص — نیست کس را ز کمند سر زلف تو خلاص — میکشی عاشق مسکین و نترسی ز قصاص

از رقیبت دلم نیافت خلاص — زانکه القاص لایحب القاص

ردیف ض حسن جمال تو جہاں جملہ گرفت طول و عرض — شمس فلک خجل شد از رخ خوب ماہ ارض

بیا کہ بشنوم بوی جاں از آں عارض — کہ یافتم دل خود را نشاں از آں عارض

ط گرد غدا یار ما تا بنوشت دور خط — ماہ فلک زردی او راست فتاد در غلط

ظ ز چشم بد رخ خوب ترا خدا حافظ — کہ کرد جملہ نکوئی بجای ما حافظ

ع بفر دولت گیتی فروز شاہ شجاع — کہ باکسم نبود بہر مال و جاہ نزاع

ق کس مباد چو من خستہ مبتلای فراق — کہ عمر من ہمہ بگذشت در بلای فراق

ل رہروان را عشق بس باشد دلیل — آب چشم اندر رہش کردم سبیل

ای بردہ دلم را تو بدین شکل و شمائل — پروای کست نیست جہانی بتو مائل

بسحر لعبت چشم تو ای خجستہ خصال — بر مرخط تو ای آیت ہمایوں فال

روز عید است و من امروز در آں تدبیرم — کہ دہم حاصل سی روزہ و ساغر گیرم

م در غم خویش چناں شیفتہ کردی بازم — کز خیال تو بخود نیز نمی پردازم

ایں چہ شوریست کہ در دور قمری بینم — ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم

الم یان للاحباب ان تیرحموا — وللناقضین العہد ان یتندموا

ن دلبر جانان من بردہ دل و جان من — بردہ دل و جان من دلبر جانان من

دلم ز دانشہ سر زلف تو مسکن — بہ نیسانش فرو مگذار و مشکن

در بدخشاں لعل اگر از سنگ می آید بروں — آب رکنی چوں شکر از تنگ می آید بروں

۵۰ ای ز فروغ رویت روشن چراغ دیدہ — مانند چشم مستت چشم جہاں ندیدہ

عید است و موسم گل ساقی بیار بادہ — ہنگام گل کہ دیدہ بی می قدح نہادہ

نصیب من چو خرابات کردہ است الہ — دریں میانہ بگو زاہدا مرا چہ گناہ



ردیف ی بفراغ دل زمانی نظری بماہروئی — بہ از آں کہ تاج شاہی ہمہ عمر ہای و ہوئی

ای باغم تو مارا پیوند لایزالی — قد ضاع فی ہواکم عمری ولا ابالی

ای ز شرم عارضت گل غرق خوی — پرعرق پیش عقیقت جام می

ای باد نسیم یار داری — زاں نفحہ مشکبار داری

پدید آمد رسوم بیوفائی — نماند از کس نشان آشنائی

برو زاہد بامیدی کہ داری — کہ دارم ہمچو تو امیدواری

جاں فدای تو کہ ہم جانی و ہم جانانی — ہر کہ شد خاک درت رست ز سرگردانی

چوں در جہاں خوبی امروز کامگاری — شاید کہ عاشقاں را کامی ز لب برآری

ساقی اگرت ہواست با می — جز بادہ میار پیش ہاشی

خوشتر از کوی خرابات نباشد جائی — کہ بپیرانہ سرم دست دہد ماوائی

نور خدا نمایدت آئینۂ مجردی — از در ما در آ اگر طالب عشق سرمدی

ان پوری غزلوں کے علاوہ متفرق ابیات جو موجودہ غزلوں میں شامل کر دیے گئے ہیں دیوان خلخالی کے صفحہ ۴۸ تا ۹۰ پر اس تفصیل سے مندرج ہیں ردیف ا: ۱ ابیت، ب = ۴، ت = ۵۸ بیت، د = ۱۰۵ بیت، ر = ۴، ز = ۵، س = ۱، ش = ۸، ع = ۲، ف = ۱، ق ۱، ک = ۱، ل = ۱۱، م = ۶۰، ن = ۴، و = ۹، ہ = ۸، ی = ۵۰

علاوہ بریں حسب ذیل غزلیں بھی خلخالی کے نزدیک الحاقی ہیں" احتمال قوی میرفت کہ از حافظ نباشد" (ص ۸۰)

ہنگام نوبہار گل از بوستاں جدا — یارب مباد ہیچکس از دوستاں جدا

صبحدم بکشاد خماری در میخانہ را — قلقل آواز صراحی جان دہد مستانہ را

از من دل شده آں یار نمی پرسد ہیچ    خبر این دل بیمار نمی پرسد ہیچ

ای چشمت از خمار سیاہ و سفید و سرخ    وی دستت از نگار سیاہ و سفید و سرخ

مینویسم سخن از آتش دل بر کاغذ    جای آنست کہ گر شعلہ فتد بر کاغذ

ذرہ آں مہ ندارد مہربانی العیاذ    درمیاں آں مہ مہر فروزاں العیاذ (کذا)

نیستی گر عاشقی را عاشقی ہمراہ گیر    پای بر فرق خداوند کلاہ و جاہ گیر

مستم از بادۂ شبانہ ہنوز    ساقی نا رفتہ خانہ ہنوز

قصائد | حافظ کے صرف ۵ مستند قصیدے ہیں، باقی سب الحاقی و مشتبہ ہیں، غیر مشتبہ نظموں کے مطلعے حسب ذیل ہیں:

شد عرصۂ زمین چو بساط ارم جواں    از پرتو سعادت شاہ جہانیاں

ز دلبری نتواں لاف زد بآسانی    ہزار نکتہ درین کار ہست تا دانی

جوزا سحر نہاد حمائل برابرم    یعنی غلام شاہم و سوگند میخورم

سپیدہ دم کہ صبا بوی لطف جاں گیرد    چمن ز لطف ہوا نکتہ بر جناں گیرد

ای در رخ تو پیدا انوار پادشاہی    در فکرت تو پنہاں صد حکمت الہی

ان میں دوسرے اور تیسرے مطلعے غزلیات کے ضمن میں آگئے، باقی تین مرزا محمد نے اپنے مرتبہ دیوان کے شروع[1] میں شامل کردیے ہیں اور ان کے متعلق اس طرح[2] لکھا ہے:

"درخصوص قصائد خواجہ نیز از لحاظ عدۂ قصائد و عدد ابیات ہر قصیدہ اساس طبع خود را منحصراً ہمیں نسخۂ خط منعم الدین شیرازی کہ ما بین نسخ موجودہ نزد من فعلاً قدیم ترین نسخہ ایست کہ دارای قصائد خواجہ است قرار دہیم و ہرچہ قصائد در این نسخہ موجود است چاپ کنیم

[1] مقدمہ دیوان ص "قیو" تا "قلب"۔ [2] صفحہ ۱۰ [3] ایضاً ص "قیہ"



و ہرچہ در آں نیست بکلی از آں صرف نظر نمائیم چہ بظن بسیار قوی بلکہ تقریباً بنحو قطع و یقین عموم قصائد دیگری کہ در بعضی نسخ جدیدہ خطی و چاپی بنام خواجہ ثبت شدہ و در این نسخہ حاضرہ و ہمچنیں در عموم نسخ قدیمہ دیگر اثری از آنہا نیست جمیعاً الحاقی است و ہیچکدام از آنہا بدون ہیچ شک و شبہہ از خواجہ نیست چہ علاوہ بر فقدان کلی آنہا در عموم نسخ قدیمہ ہم از حیث سبک و اسلوب و ہم از حیث مضامین و افکار و مشرب نیز ما بین آنہا و ما بین خواجہ بعد المشرقین است و مخصوصاً بعضی از آنہا فی الواقع سخیف ترین و رکیک ترین، و سست ترین اشعاری است کہ ہرگز بمخیلۂ کسی خطور نتواند کرد و حتی بشعرای درجۂ سوم و چہارم آنہا را نمی توان نسبت داد تا چہ رسد بزرگ ترین شاعر غزل سرای ایران"

اس رکیک و سست قصیدہ سے مراد وہی قصیدہ الحاقی ہے، جس کے چند اشعار ہم اوپر نقل کرچکے ہیں، اس کے علاوہ حسب ذیل قصیدے[1] بھی ان کی جانب منسوب ہیں

مرا دلیست پریشاں بدست غم پامال[2]    چنانکہ ہیچ کسی نیست واقف احوال

خیر مقدم[3] مرحبا ای طائر میمون قدم    شادماں کردی مرا نازم ترا سر تا قدم

مثنویات | دیوان خلخالی اور دیوان قزوینی میں صرف ایک مثنوی حافظ کی طرف منسوب ہے، جس کا مطلع یہ ہے:

الا ای آہوی وحشی کجائی    مرا با تست بسیار آشنائی

صرف یہی مثنوی دیوان لکھنؤ میں بھی ہے لیکن ڈاکٹر محمد معین نے تین اور مثنویاں ان کی طرف

[1] ڈاکٹر معین نے حافظ کی طرف ۹ قصیدے منسوب کیے ہیں جن میں تین تو مرزا محمد والے نسخے والے ہیں (دو غزلوں میں شامل کرچکے ہیں) اور باقی تین وہی الحاقی قصیدے ہیں، اور تعجب یہ ہے کہ اس سست قصیدے کے متعلق نہایت سخت رائے کا اظہار بھی کرچکے ہیں، حافظ شیریں سخن ص ۳۸۵-۳۸۷ نیز ص ۳۱۱ [2] دیوان خلخالی ص ۴ (ملحقات) [3] دیوان چاپ لکھنؤ ۱۸۸۵ء ص ۴۵۲

منسوب کی ہیں، جن میں پہلی دو میں سعدی کی، اور تیسری میں نظامی کی پیروی کی ہے، یہ تینوں مثنویاں الحاقی ہیں،[1]

مثنوی کے علاوہ خلخالی اور قزوینی نے ایک ساقی نامہ ۵۶ بیت کا حافظ کی طرف منسوب کیا ہے، جو اس طرح شروع ہوتا ہے،

بیا ساقی آں مے کہ حال آورد — کرامت فزاید کمال آورد

حسین پژمان[2] کے مرتبہ دیوان میں یہ ساقی نامہ دو شمارہ میں، چاپ قدسی میں ۲ حصے میں، چاپ بمبئی میں ۸ شمارہ میں آیا ہے۔[3] چاپ لکھنؤ میں ساقی نامہ دو عنوان سے پایا جاتا ہے، مگر اس ساقی نامے کے بیشتر اشعار خواجو کرمانی[4] کے ہیں، اس لحاظ سے ساقی نامہ کے زیادہ اشعار الحاقی ہیں، چنانچہ خلخالی نے ۱۲۹ اشعار الحاقی قرار دیے ہیں،[5] مثنوی میں بھی ۳[6] شعر بعد والے نسخوں میں زیادہ ہیں،

**مقطعات** دیوان خلخالی میں ۲۹ قطعے غیر مشکوک ہیں، قزوینی نے ۵ غیر مشکوک قطعوں کا اور اضافہ کیا ہے، حسین پژمان والے نسخے میں ۴۴ قطعے[7] اصیل بتائے گئے ہیں، خلخالی نے ۱۵ اور مشکوک قطعوں کو درج کیا ہے، لکھنؤ کے مطبوعہ نسخے میں ۱۸ ہیں،

**رباعیات** خلخالی کے مرتبہ دیوان میں ۴۲ غیر مشکوک رباعیاں ہیں، حسین پژمان نے ۴۵

---

[1] خلخالی ان تینوں کو مشتبہ قرار دیتے ہیں (ص ۷، ملحقات) نیز ا۔ک دیوان پژمان (ص ۳۰۶)

[2] دو بار کتابفروشی و چاپخانۂ بروخیم میں شائع ہوا۔ طبع دوم ۱۳۱۸ھ میرے پیش نظر ہے، ملاحظہ ہو ص ۳۰۹ جہاں "مشکوک ساقی نامہ" درج ہے [3] حافظ شیرین سخن ص ۳۸۸ [4] ملاحظہ ہو خلخالی ملحقات ص ۱، حاشیہ ونیز تذکرہ میخانہ (مطبوعہ) ص ۴، حاشیہ ۱، ہمیں ساقی نامہ بہ بعض تغیرات در دیوان حافظ (طبع لکھنؤ سنہ ۱۸۹۳ء صفحہ ۳۴۴ ببعد) موجود است [5] ص ۷۸-۸۱ (ملحقات) [6] ایضاً ص ۷۶ [7] حافظ شیرین سخن ص ۳۸۸ [8] دیوان ص ۲۸۲ تا ۲۸۸ پر مشتبہ قطعہ ملاحظہ ہو)



رباعیاں بتائی ہیں، خلخالی نے مشکوک رباعیوں کی تعداد ۲۷ قرار دی ہے، مطبوعہ نسخے میں ۶۷ ہیں[1] الحاقی رباعیوں کے پہلے مصرعے حسب ذیل ہیں:

(۱) زاں بادۂ دیرینۂ دہقاں پرورد
(۲) ای آنکہ نہند مہر و ماہ از تمکیں
(۳) تا حکم قضائے آسمانی باشد
(۴) جانا چو شبی با تو بروز آوردم
(۵) تا کے بود ایں جور و جفا کردن تو
(۶) با مردم نیک و بد نمی باید بود
(۷) باز آی کہ جانم بجمالت نگرانست
(۸) ہجرت کہ بجان من درویش آمد
(۹) شیریں دہنا ن عہد بپایاں نبرند
(۱۰) زلفین تو پیچ و خم و تاب از چہ گرفت
(۱۱) در راہِ طلب تو خارِ غمہا دارد
(۱۲) بر دار دل از او دہرای فرزند
(۱۳) مقبولِ دل خواص و مشہور عوام
(۱۴) آواز پر مرغ طرب میشنوم
(۱۵) در ہجرِ تو من ز شمع افزوں گریم
(۱۶) عیب است عظیم برکشیدن خود را
(۱۷) جانم بفدای آنکہ او اہل بود
(۱۸) سر تا سر آفاق نہادن سوُن
(۱۹) تا کار بکامِ دل مجروح بود
(۲۰) یاراں چو بہم دست در آغوش کنید
(۲۱) امروز درایں زمانۂ عہد شکن
(۲۲) اے دوست بکام دشمنانم کردی
(۲۳) از عاجزی و سلیمی و مسکینی
(۲۴) غافل منشیں ہر گز ز تیزی آہ
(۲۵) اشکم چو رخِ نگار من گلگوں شد
(۲۶) در غربت اگر کسے نماند ماہی
(۲۷) رب چو برآرندۂ حاجات توئی

ان کے علاوہ متعدد رباعیاں جو لکھنؤ اڈیشن میں موجود ہیں،[2] الحاقی ہیں،

---

[1] مطبوعہ لکھنؤ (سنہ ۱۸۸۸ء) میں خلخالی والی صرف ۲ رباعیاں موجود ہیں، باقی ۹۴ رباعیاں الحاقی ہیں۔

[2] حسین پژمان نے ص ۲۹۴-۲۹۵ پر ۱۲ مشکوک اور ص ۲۹۶-۳۰۳ پر ۶۶ رباعیاں منسوب درج کی ہیں،

**ترکیب بند و ترجیع بند و مخمس** جدید خطی نسخوں اور تمام مطبوعہ نسخوں میں ایک مخمس[1]، ایک ترکیب بند اور ایک ترجیع بند دیا ہے، مگر خلخالی اور مرزا محمد قزوینی دونوں کے مرتب کیے ہوئے دیوان میں سے ان میں سے کوئی موجود نہیں، خلخالی نے دیوان کے آخر میں[2] مشکوک ابیات کے ضمن میں ان تینوں کو درج کر دیا ہے، مخمس کا پہلا بند یہ ہے:

در عشق تو ای صنم چنانم — کز ہستی خویش در گمانم
ہر چند کہ زار و ناتوانم — گر دست دہد ہزار جانم
در پای مبارکت فشانم

ترکیب کے پہلے بند کا مطلع یہ ہے،

شاہی کہ پناہ ملک و دین است — درخورد ہزار آفرین است

اور ترجیع کا بند اول یوں شروع ہوتا ہے،

ای دادہ بباد دوستداری — ای بردہ ملال و عہد یاری

بیت ترجیع

آں بہ کہ ز صبر رخ نتابم — باشد کہ مراد دل بیابم (باقی)

---

[1] نیز ملاحظہ ہو دیوان مرتبۂ پژمان ص ۳۱۲، اسی دیوان کے ص ۴۲۳ بعد پر دو مسدس حافظ کی طرف منسوب ہیں۔ [2] ص ۲۷ تا ۹۷،





# امام اشعری اور مستشرقین

از جناب مرزا محمد یوسف صاحب حقانی استاد مدرسۂ عالیہ رامپور

(۳)

(۲۸) کتاب الاستشہاد: جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ معتزلہ کے دلائل سے خدا کا علم، قدرت اور دوسری صفات ثابت ہوتی ہیں۔[1]

یہ ترجمہ گمراہ کن حد تک مبہم ہے، اصل میں ہے:

| | |
|---|---|
| الفنا کتابا فی الاستشہاد ارینا | ہم نے اصول استشہاد کے باب میں ایک کتاب |
| فیہ کیف یلزم المعتزلۃ علی | تالیف کی جس میں ہم نے یہ دکھایا ہے کہ معتزلہ جو |
| حجتہم فی الاستشہاد بالشاہد | شاہد سے غائب پر استدلال و استشہاد کیا کرتے ہیں |
| علی الغائب ان یثبتوا علم اللہ | انکے اس استدلال سے خود ان پر لازم ہو جاتا ہے |
| وقدرتہ وسائر صفاتہ[2] | کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت اور دیگر صفات کا اثبات |

یہ ہے اصول استشہاد کی حقیقت اور اسکی افادیت کے متعلق امام اشعری اور ان کے متبعین کا موقف،

مگر مسٹر مکارتھی کے ترجمے سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام اشعری نے کوئی کتاب لکھی تھی، جسے ایک رنگین عنوان سے معنون کرنے کے لیے کتاب الاستشہاد کا نام دیا تھا، نیز معتزلہ جو دلائل دیتے تھے، اس سے خود صفات باری کا اثبات ہوتا ہے،

---

[1] معارف ص ۲۹۹ سطر ۹-۱۰ [2] تبیین ص ۱۳۱ سطر ۱۷-۱۹

لیکن یہ واقعہ نہیں ہے، بلکہ "استشہاد" دیگر منطقی اعمال کی طرح ایک خاص انداز استدلال کا نام تھا، جسے عموماً قیاس الغائب علی الشاہد کہتے تھے اور جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے لیے (جو حواس سے غائب ہے) جب کوئی حکم ثابت کرنا چاہتے تھے، تو اس کو ممکنات پر (جو مشہود ہیں) قیاس کیا کرتے تھے کہ چونکہ یہ حکم شاہد کے لیے ثابت ہے اسلیے غائب کے لیے بھی ثابت ہوگا۔ چنانچہ شرح المواقف میں ہے:

| | |
|---|---|
| الطریق الثانی من ذینک الطریقتین الضعیفین قیاس الغائب علی الشاہد وانما یسلکونہ اذا حاولوا اثبات حکم للہ سبحانہ فیقیسونہ علی الممکنات قیاساً فقہیاً ویطلقون اسم الغائب علیہ تعالیٰ لکونہ غائباً عن الحواس[1] | ان دو ضعیف طریقوں میں سے دوسرا طریقہ قیاس الغائب علی الشاہد ہے، اس طریقہ کو صرف اسوقت استعمال کرتے تھے جب اللہ تعالیٰ کے واسطے کوئی حکم ثابت کرنا چاہتے تھے تو اسے ممکنات پر بطور قیاس فقہی (analogy) قیاس کرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ پر "اسم غائب" کا اطلاق کرتے تھے کیونکہ وہ حواس سے غائب ہے، |

اشاعرہ اس کی افادیت کلیہ کے منکر تھے، شرح المواقف میں ہے،

| | |
|---|---|
| وھو ای ھذا الاثبات بطریق الیقین مشکل جداً[2] | اور وہ یعنی اس بات کا یقینی طور پر ثابت کرنا بہت زیادہ مشکل ہے، |

لیکن یہ انداز استدلال بعض غیر مسلم متکلمین کا عموماً اور معتزلہ کا خصوصاً معمول بہ تھا، اور وہ اکثر شاہد سے غائب پر استشہاد کے ذریعہ حجت قائم کیا کرتے تھے، اس لیے امام اشعری نے بطریق الزام ان پر حجت قائم کی کہ ان کے اس انداز استدلال[3] کی صحت کی صورت میں ان پر لازم آتا ہے کہ وہ علم و قدرت اور دیگر صفات باری کا بھی اثبات کریں، مثلاً ہم شاہد میں دیکھتے ہیں کہ انسان عالم بھی ہے

[1] و [2] شرح المواقف [3] مجتہم الاستشہا و بالشاہد علی الغائب،



متکلم بھی ہے، سمیع بھی ہے، بصیر بھی ہے، لہذا اگر غائب کو شاہد پر قیاس کیا جا سکتا ہے، تو ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ علم قدرت اور دیگر صفات سے متصف ہے، (حالانکہ معتزلہ صفات باری کی نفی کرتے تھے)[1]

یہ الزامی انداز استدلال اشاعرہ کا معمول بہ تھا، چنانچہ قاضی ابوبکر الباقلانی اپنی کتاب التمہید (ص ۹۷، ۹۸) میں جب براہمہ نبوت کے محال ہونے کو قیاس الغائب علی الشاہد کے اصول پر ثابت کرنا چاہتے ہیں تو ان کی اس تعلیل فاسد کی تضعیف اسی الزامی انداز میں کرتے ہیں،

| | |
|---|---|
| فان قالوا: الدلیل علی انہ لا یجوز ان یرسل اللہ رسولاً الی خلقہ انا وجدنا الرسول فی الشاھد والمعقول فی جنس المرسل ............فیقال لھم فیجب علی اعتلالکم ھذا ان یکون اللہ سبحانہ محتجاً علی الخلق ولا آمراً لھم بما وضعہ فیھا عندکم من وجوب فعل الحسن و ترک القبیح .........لان المحتج الآمر فی الشاھد من جنس المامور المحتج علیہ | پس اگر براہمہ یہ کہیں کہ اس بات کی دلیل کہ اللہ تعالیٰ کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کو مخلوق کی جانب رسول بنا کر بھیجے یہ ہے کہ شاہد و معقول میں پیمبر بھیجنے والے کی جنس سے ہوتا ہے............ تو ان سے کہا جائیگا کہ تمھارے استدلال پر لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ مخلوق پر حجت قائم کرنے والا ہو نہ انھیں حکم دینے والا ہو بوجہ اس اصول کے جو اس نے تمھارے قول کے مطابق ان میں وضع کر دیا ہے کہ اچھے کام کرنا واجب اور برے کا چھوڑنا فرض ہے.........کیونکہ شاہد میں حجت قائم کرنے والا اور حکم دینے والا اسی جنس سے ہوا کرتا ہے، جس سے وہ شخص جسے حکم دیا جائے اور جس پر حجت قائم کی جائے، |

اسی طرح اس سے ذرا قبل فرماتے ہیں؛

[1] الفرق بین الفرق ص ۹۳

| | |
|---|---|
| ویقال لهم ان بنیتم الامر علی | اور ان سے کہا جائیگا کہ اگر تم اپنے گمان کے مطابق مسئلہ |
| قیم ذلك فی الشاهد بزعمکم فیجب | کی بنیاد اس بات پر قائم کرتے ہو کہ شاہد میں یہ بات قبیح |
| ان تقضوا علی ان الفاعل للعالم | ہے تو تم پر واجب ہے کہ یہ بھی تسلیم کرو کہ فاعل عالم کسی |
| لا یفعله الا لاجتلاب منفعة | فائدے کے حصول یا کسی نقصان کے دور کرنے یا کسی ایسی |
| او دفع مضرة او داعٍ دعاه الی | غرض کے لیے جس نے اسے اس کام پر آمادہ کیا ہو، |
| الفعل وبعثه علیه وانه تعالیٰ | کوئی کام نہیں کرتا اور یہ کہ اللہ تعالیٰ جسم ہے، حیز رکھتا ہے، |
| جسم مولف ذو حیز وقبول للاعراض | اعراض کو قبول کرنے والا اور مخصوص مکان میں متمکن ہے |
| وفی مکان دون مکان، لانکم لم | کیونکہ شاہد میں تم کسی فاعل کا ان صفات کے متصف ہوئے |
| تعقلوا فاعلاً فی الشاهد الا کذالک | بغیر تصور نہیں کر سکتے، |

لیکن مسٹر مکارتھی کہتے ہیں "کتاب الاستشهاد" جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ معتزلہ کے دلائل سے خدا کا علم، قدرت اور دوسری صفات ثابت ہوتی ہیں"

معتزلہ کے دلائل بے شمار تھے، ان میں سے یہاں کون سے دلائل وانداز استدلال مراد ہیں، مسٹر مکارتھی کے ترجمے سے اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا، حالانکہ تبیین ابن عساکر میں اس کی پوری وضاحت موجود ہے،

(۹۴) شئی پر ایک کتاب: اس میں اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ اشیاء بہر حال اشیاء ہیں چاہے وہ معدوم ہوں[۱] یہ ترجمہ مبہم ہی نہیں بلکہ یقیناً غلط ہے، اصل یہ ہے:

| | |
|---|---|
| والفنا کتابا فی باب شئ وان الاشیأ | اور ہم نے شئی (کے مباحث) پر ایک کتاب تالیف کی (بالخصوص |
| هی اشیاء وان عدمت رجعنا عنه | اس مسئلے میں) کہ اشیاء بہر حال اشیا ہیں اگرچہ وہ معدوم ہوں، |
| ونقضناه فمن دفع الیه فلا یعولن علیه[۲] | ہم نے اس کتاب سے (بعد میں) رجوع کر لیا اور اس کی تردید لکھی، |
| | پس کسی کو ہماری کتاب ملے تو اس پر ہرگز اعتماد نہ کرے، |

[۱] معارف صفحہ ۳۰۰ سطرہ ۶ - [۲] تبیین ص ۱۳۳ سطرہ ۶،



یہ دو کتابیں ہیں، ایک امام اشعری کے زمانہ اعتزال کی اور دوسری اعتزال سے تائب ہونے کے بعد کی، پہلی کا نام ہے

"کتاب فی باب شئ وان الاشیاء هی اشیاء وان عدمت"

اس کی تفصیل یہ ہے کہ فلاسفہ میں افلاطون امثال مجردہ ( Logos ) کا قائل تھا، بعد کے حکما پر اس کا بڑا گہرا اثر پڑا، چنانچہ جب افلاطونی اور ارسطاطالیسی فلسفوں میں تطبیق کی کوشش کی گئی، تو حکمائے متاخرین نے اعیان وحقایق کے وجود اور ماہیت میں تفریق وانفکاک کا اصول تراشا کہ ممکنات کا وجود ان کی ماہیت پر زاید ہوتا ہے، لہذا ماہیت وجود سے خالی ہو سکتی ہے یعنی اعیان صفت وجود سے متصف ہوئے بغیر بھی اعیان بنے رہتے ہیں،

تیسری اور چوتھی صدی کے معتزلیوں نے بھی فلاسفہ سے اس "جواز تعری الماهیة عن الوجود" کے مسئلے کو اخذ کر کے یہ موقف اختیار کیا کہ معدوم ممکن نفی محض نہیں ہے، بلکہ من وجہٍ ثابت ہے، ان مفکرین معتزلہ میں ابو علی الجبائی خصوصی اہمیت رکھتا ہے، وہ اپنے عہد کا سید الطائفہ اور ایک مستقل مذہب "الجبائیہ" کا بانی تھا، اس کی بھی یہی رائے تھی، چنانچہ المحصل میں امام رازی نے "تفصیل قول الفلاسفہ والمعتزلہ فی المعدومات" کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

| | |
|---|---|
| زعم ابو یعقوب الشحام وابو علی | ابو یعقوب الشحام ابو علی الجبائی اور (موخر الذکر کے |
| الجبائی وابنه ابو هاشم...... | بیٹے) ابو ہاشم کا گمان ہے کہ معدومات ممکنہ وجود میں |
| ...... ان المعدومات الممکنة | داخل ہونے (موجود ہونے) سے پہلے |
| قبل دخولها فی الوجود ذوات و | بھی ذوات اور اعیان اور حقایق |
| اعیان وحقایق[۱] | ہوا کرتے ہیں، |

[۱] المحصل ص ۳۷،

اسی الجبائی کے شاگرد رشید امام ابو الحسن الاشعری تھے، اس لیے وہ بھی اپنے زمانۂ اعتزال میں اس عہد کے معتزلی متکلمین کی طرح اسی مسلک کے قائل تھے، اور اسی لیے انھوں نے "کتاب فی باب شیٔ و ان الاشیاء ہی اشیاء وان عدمت" کے نام سے وقت کے اس مروجہ مسئلے پر اپنے افکار کو قلمبند کیا، غرض یہ ایک کتاب ہے جو امام اشعری نے اپنے زمانۂ اعتزال میں تصنیف کی تھی لیکن "ان الاشیاء ہی اشیاء وان عدمت" کا مسئلہ محض ایک دلچسپ حماقت ہی نہیں بلکہ اپنے اندر ایک خطرناک الحاد کو چھپائے ہوئے ہے، کیونکہ اگر اس مسئلے کو اس کی آخری حد تک سونچا جائے تو اس کا یہ ملحدانہ منطقی نتیجہ برآمد ہوتا ہے، جو بعض معتزلہ کا مسلک بھی تھا کہ "اس علم کے بعد کہ دنیا کا ایک پیدا کرنے والا ہے، پھر بھی یہ شک باقی رہتا ہے کہ وہ صانع عالم موجود بھی ہے یا نہیں" امام رازی کہتے ہیں:

| | |
|---|---|
| واتفقوا علی انہ بعد العلم بان للعالم | اسپر معتزلہ کا اتفاق ہے کہ اس بات کے علم کے بعد بھی کہ |
| صانعاً عالماً قادراً حیا حکیما مرسلا | عالم کا ایک صانع ہے جو عالم ہے قادر ہے حی (زندہ) ہے |
| للرسل یمکننا الشک فی انہ ھل ھو | حکیم ہے اور رسولوں کو بھیجنے والا ہے، ہمارے لیے یہ |
| موجود اولا الا ان نعرف ذالک | شک کرنا ممکن ہے کہ آیا وہ موجود ہے یا نہیں، الایہ کہ |
| بالدلیل لانھم لما جوزوا اتصاف | ہم اس صانع عالم کے وجود کو کسی (خارجی) دلیل سے |
| المعدوم بالصفة لم یلزم من اتصاف | جان لیں، کیونکہ جب معتزلہ نے یہ جائز قرار دیا کہ معدوم |
| ذات اللہ تعالی بصفة العالمیة | (بھی) صفت سے متصف ہو سکتا ہے تو اللہ تعالی کے عالمیت |
| والقادریة کونہ موجوداً[1] | اور قادریت کی صفات سے متصف ہونے سے یہ لازم نہیں |

اس لیے جب تیسری صدی کے اختتام پر امام اشعری اعتزال سے تائب ہوئے تو جہاں معتزلہ کی اور بدعات سے توبہ کی اس مسئلے سے بھی رجوع کیا، اور اپنے مسلک قدیم کی تردید میں ایک مستقل کتاب لکھی، چنانچہ خود فرماتے ہیں:

[1] المحصل ص ۳۰



| | |
|---|---|
| رجعنا عنہ ونقضناہ[1] | ہم نے اس کتاب سے رجوع کیا اور اسکی تردید لکھی |

اس رجوع کا نتیجہ اشاعرہ کا مذہب مختار ہے کہ وجود واجب اور ممکن دونوں میں عین ماہیت ہوا کرتا ہے، چنانچہ شرح المواقف میں ہے:

| | |
|---|---|
| المقصد الثالث فی ان الوجود | مقصد سوم اس بحث میں کہ وجود نفس ماہیت ہے، |
| نفس الماھیة او جزءھا او زائد | یا ماہیت کا جزء ہے یا ماہیت پر زائد (ماہیت سے علحدہ) |
| علیھا...... فاما ان یکون نفس | ہے...... پس یا تو سب میں یعنی واجب اور ممکن |
| الماھیة فی الکل ای الواجب | دونوں میں وجود نفس ماہیت ہوگا یا سب میں |
| والممکن جمیعاً او زائداً علیھا | (واجب اور ممکن دونوں میں) ماہیت پر زائد ہوگا، |
| فی الکل او یکون نفس الماھیة فی | یا واجب میں نفس ماہیت ہوگا اور ممکن میں ماہیت |
| الواجب زائداً علیھا فی الممکن | پر زائد ہوگا...... پس اس مسئلے میں تین مذہب |
| ...... فانحصرت المذاھب | ہو گئے، ان میں سے ایک شیخ ابی الحسن الاشعری |
| فی ثلثة احدھا للشیخ ابی الحسن | اور معتزلہ میں سے ابی الحسین البصری کا مذہب ہے کہ |
| الاشعری وابی الحسین البصری | وجود واجب اور ممکن دونوں میں نفس حقیقت |
| من المعتزلہ انہ نفس الحقیقة | (عین ماہیت) ہوتا ہے....... |
| فی الکل ای الواجب والممکنات کافة | ........... |

غرض یہ (نقض و تردید) ایک مستقل کتاب ہے، مگر مسٹر مکارتھی نے امام اشعری کی کتابوں کی تعداد لکھتے وقت دونوں کتابوں کو ایک ہی کتاب محسوس کیا حالانکہ تبیین میں جو کچھ "العمد" سے نقل کیا گیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب نے دو مستقل کتابیں لکھی تھیں، پہلی "ان

[1] تبیین ص ۱۳۳، سطر ۹

الاشیا ہی اشیا، وان عدمت" کی تائید میں اور دوسری اس کی تردید میں، لیکن جناب مستشرق کی مہربانی نے دو کتابوں کو ایک کتاب بنا کر خلط مبحث کر دیا "شئی پر ایک کتاب۔ اس میں اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ اشیا، بہر حال اشیا ہیں، چاہے وہ معدوم ہوں۔"

(۶۷) جبائی کے سوالوں کے جواب میں [1]

قارئین کرام کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ آخر وہ کیا سوالات تھے جو الجبائی نے کیے تھے، مسٹر مکارتھی نے ان سوالات کی نوعیت سے تعرض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، حالانکہ تبیین کی روایت کے مطابق امام صاحب نے ان سوالات کی نوعیت بھی کھول کر بیان کر دی ہے، اصل میں ہے:

| | |
|---|---|
| والفنا کتابا اجبنا فیہ عن مسائل | ہم نے ایک کتاب تالیف کی جس میں الجبائی کے |
| الجبائی فی النظر والاستدلال | ان سوالات کا جواب دیا جو اس نے نظر و استدلال |
| وشرائطه [2] | اور شرائط نظر کے سلسلے میں کیے تھے۔ |

غالباً مسٹر مکارتھی "نظر" اور "استدلال" کے مصداق سے کما حقہ واقف نہ تھے، اس لیے انھوں نے اس کو صاف اڑا دیا، حالانکہ نظر و شرائط نظر اور استدلال مفکرین اسلام کا خاص موضوع رہے ہیں، اور اصول و کلام کی تمام مستند کتابیں ان کی بحثوں سے معمور ہیں، مثال کے لیے شرح المواقف کو لیجیے، موقف اول کا مرصد خامس مسائل نظر کی، اور موقف سادس مسائل استدلال کی تبیین و توضیح اور بحث و تمحیص پر مشتمل ہے، اسی طرح قاضی بیضاوی کی طوالع الانوار کے مقدمہ میں ان مباحث کا ذکر کیا گیا ہے، اور اس کی فصل ثالث میں حجج (استدلال) کا اور فصل رابع میں خصوصیت سے احکام نظر کا ذکر ہے، اسی طرح ابن حاجب (المتوفی سنہ ۶۴۶ھ) نے مختصر منتہی الاصول کے مقدمہ میں مسائل نظر و استدلال کو ذکر کیا ہے [3] اس کے علاوہ اور بہت سی تحریروں میں اسکا ذکر ہے، مگر مسٹر مکارتھی نے اس

---

[1] معارف ص ۳۰۰ سطر ۱۸ [2] تبیین ص ۱۳۴ سطر ۱۱ - ۱۲ [3] مختصر المنتہی الاصول ص ۲۰۴



کتاب کے موضوع کی اتنی توضیح بھی نہیں کی جتنی "تبیین کذب المفتری" کی ظاہر عبارت سے مستفاد ہو سکتی تھی،

(۶۹) کتاب فی الرد علی الفلاسفہ: اس میں تین مقالے ہیں: ابن قیس مناوی کے رد میں، ہیولیٰ اور طبائع پر یقین رکھنے والوں کے رد میں اور ارسطو کے ان خیالات کے رد میں جو عالم اور افلاک سے متعلق ہیں، [1]

یہ ترجمہ بھی گمراہ کن ہے، اگر قارئین کرام اس کا تبیین کذب المفتری کی اصل عبارت سے موازنہ فرمائیں گے تو یہ چیز واضح ہو جائے گی، تبیین میں ہے:

| | |
|---|---|
| والفنا کتابا فی الرد علی الفلاسفة | اور ہم نے فلاسفہ کے رد میں ایک کتاب لکھی جو |
| یشتمل علی ثلاث مقالات ذکرنا | تین مقالوں پر مشتمل ہے، اس میں ہم نے ابن قیس دہری |
| فیه نقض علی ابن الفیس الدهری | کے دلائل کا رد کیا ہے اور ان لوگوں پر جو ہیولیٰ |
| وتکلمنا فیه علی القائلین بالهیولیٰ | کے قائل ہیں یا طبائع کے قائل ہیں (مادہ پرست |
| والطبائع ونقضنا فیه علل ارسطاطالیس | یا میٹریلسٹ) پر اعتراض کیے ہیں، اور ارسطو |
| فی السماء والعالم۔ وبینا ما علیهم | کی ان دلیلوں کی تردید کی ہے جو اس نے "کتاب السماء |
| فی قولهم باضافة الاحداث | والعالم" میں بیان کی ہیں، اور یہ بیان کیا ہے کہ |
| بالنجوم وتعلیق احکام السعادة | منجمین جو حوادث روزگار کے ستاروں کی جانب منسوب |
| والشقاوة بها [2] | ہونے کے قائل ہیں اور جو نیک بختی اور بدبختی کے |
| | احکام کو ستاروں کی گردش سے متعلق سمجھتے ہیں ان پر |

ان کے اس قول کی تردید کی ہے [illegible] ہیں۔

چند چیزیں قابل غور ہیں:

۱۔ مسٹر مکارتھی نے "الدہری" کا ترجمہ "مناوی (غالباً مادی) کیا ہے، حالانکہ دہریہ اور مادہ پرستوں میں

---

[1] معارف ص ۳۰۰ سطر ۱۹ صفحہ ۳۰۱ سطر ۱-۲ [2] تبیین ص ۱۳۴ سطر ۱۲-۱۷

بڑا فرق ہے،

۲۔ "ارسطو کے ان خیالات کے رد میں جو عالم اور افلاک سے متعلق ہیں"!! کاش اگر مسٹر مکارتھی نے اسلامیات کا مطالعہ کیا ہوتا تو معلوم ہوتا کہ "السماء والعالم" ارسطو کی ایک کتاب کا نام ہے، جسے لاطینی زبان میں "De Coelo" اور اصل یونانی میں "περὶ οὐρανοῦ" کہتے ہیں، ابن الندیم "الفہرست" میں ارسطو کی کتب طبعیات کے ضمن میں کہتا ہے،

| | |
|---|---|
| کتاب السماء والعالم پر کلام: وہ چار مقالات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو ابن البطریق نے نقل کیا اور حنین نے اس ترجمہ کی اصلاح کی | الکلام علی کتاب السماء والعالم: وھو اربع مقالات نقل ھذا الکتاب ابن البطریق واصلحہ حنین....[1] |

اسی عبارت کو قفطی نے بھی ارسطاطالیس کے ذکر میں دہرایا ہے:

"کتاب السماء والعالم والکلام علیہ وھو اربع مقالات نقل ھذا الکتاب ابن البطریق"[2]

یہی نہیں بلکہ قفطی نے "الفہرست" کے علاوہ ایک دوسرے حوالے سے ارسطو کی جو فہرست دی ہے (جو ایک شخص مسمی بطلیموس کے مکتوب بنام غلس سے ماخوذ ہے) اس میں بھی اس کتاب کا ذکر ہے: کتابہ فی السماء والعالم اربع مقالات[3]۔ اسی کتاب السماء والعالم کی تلخیص دوسرے لوگوں کے علاوہ ابن رشد الاندلسی نے بھی کی، جسے دائرۃ المعارف حیدرآباد نے شائع کر دیا ہے، مگر تعجب ہے مسٹر مکارتھی ان سب حقایق سے ناآشنا ہیں اور بیدریغ یہ لفظی ترجمہ کر دیا ہے کہ "ان خیالات کے رد میں جو عالم اور افلاک سے متعلق ہیں"۔

۳۔ اس کتاب کے موضوع کا تیسرا جزء منجمین کا رد ہے جو اس بات کے قائل تھے کہ حوادث روزگار گردش نجوم کا نتیجہ ہیں اور نیک بختی کو ستاروں سے متعلق گردانتے تھے،

---

۱ الفہرست لابن الندیم ص ۳۵۰ ۲ اخبار العلماء باخبار الحکماء ص ۳۰ ۳ ایضاً ص ۳۳ سطر ۱۸



| | |
|---|---|
| ان کے حوادث روزگار کو ستاروں کی طرف منسوب کرنے اور نیک بختی و بدبختی کے احکام کو ان ستاروں سے متعلق سمجھنے کے عقیدے کے باب میں | فی قولھم باضافۃ الاحداث بالنجوم وتعلیق احکام السعادۃ والشقاوۃ بھا |

منجمین کی تردید متکلمین اسلام کا عام موضوع تھی، چنانچہ امام اشعری کے شاگرد کے شاگرد، قاضی ابوبکر الباقلانی نے "التمہید" میں مفصل طور پر منجمین کا رد کیا ہے، اس باب کا نام ہے باب الکلام علی المنجمین امام اشعری نے بھی اس کتاب کے اس جزء میں ان ایرادات و اعتراضات کو بیان کیا ہے جو منجمین پر وارد ہو سکتے ہیں لیکن مسٹر مکارتھی نے اس کا ترجمہ تک کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی،

(۲۶) ابو الہذیل کے رد میں حرکت کے سلسلے میں[1]

یہ ترجمہ اگر گمراہ کن نہیں تو حیران کن ضرور ہے، اس سے محض یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابو الہذیل العلاف یا تو حرکت کے وجود خارجی کا قائل تھا، یا منکر اور امام اشعری نے اس کا رد کیا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، اس کی تفصیل یہ ہے:

متکلمین حدوث عالم کے قائل ہیں، یعنی سلسلۂ حوادث کو ازل کی جانب کہیں نہ کہیں منقطع ہونا چاہیے، اور وہی بدو آفرینش و تخلیق کائنات ہے، ابو الہذیل العلاف بھی اس عقیدے کا سرگرم مبلغ تھا، ایک مجلس مناظرہ میں اس سے کہا گیا کہ تم لوگ اس بات کے قائل ہو کہ سلسلۂ حوادث ابد کی جہت میں لاالی نہایت چلا جاتا ہے، مثلاً سکان بہشت ابد الآباد تک نعیم جنت سے محظوظ ہوتے رہیں گے تو جس طرح سلسلۂ حوادث ابد کی جہت میں لاالی نہایت جا سکتا ہے، اسی طرح ازل کی جہت میں بھی لاالی نہایت جا سکتا ہے، لہذا عالم کے لیے حدوث زمانی (Creation in Time) ضروری نہیں، یہ سنکر ابو الہذیل سٹ پٹا گیا، اور کہنے لگا نہیں،

---

۱ معارف ص ۳۰۱

جس طرح حوادث کے سلسلہ کا ازل میں ممتد الی لانہایۃ ہونا، ناقابل تصور ہے، اسی طرح وہ ابد میں بھی لاالی نہایۃ نہیں جاسکتا، پس بہشتیوں اور دوزخیوں کی حرکات کہیں نہ کہیں منقطع ہوجائیں گی، اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ نہ جنتی کسی مزید نعمت جنت سے محظوظ ہوسکیں گے اور نہ دوزخی کسی مزید تکلیف دوزخ سے عذاب پاسکیں گے، چنانچہ شہرستانی نے لکھا ہے،

| | |
|---|---|
| الخامسة قوله ان حرکات اهل | پانچویں قابل اعتراض بات ابو الہذیل العلاف کا |
| الخلدین تنقطع وانهم یصیرون | یہ قول کہ اہل جنت اور اہل دوزخ کی حرکات کبھی نہ کبھی |
| الی سکون دائم جموداً ....... | منقطع ہوجائیں گی اور وہ دائمی سکون کی حالت میں |
| ..... وهذا قریب من مذهب | جامد بنجائیں گی ..... یہ قول جہم بن صفوان کے مذہب کے |
| جهم اذ حکم بفناء الجنة والنار | قریب قریب ہے کیونکہ اس نے بھی جنت اور دوزخ کے فنا |
| وانما التزم ابو الهذیل هذا المذهب | ہوجانے کا حکم لگایا تھا، ابو الہذیل کو اس مذہب کا |
| لانه لما الزم فی مسئلة حدوث | اسطرح قائل ہونا پڑا کہ جب حدوث عالم کے مسئلے میں |
| العالم ان الحوادث التی لا اول لها | اسے یہ الزام دیا گیا کہ وہ حوادث جن کا آغاز نہو ان |
| کالحوادث التی لا آخر لها اذ کل | حوادث کی طرح ہیں جنکا انجام نہو، کیونکہ دونوں لامتناہی |
| واحد لا تتناهی. قال انی لا اقول | ہیں تو ابو الہذیل کہنے لگا کہ میں جسطرح ان حرکات کا |
| بحرکات لا تتناهی آخراً کما لا اقول | قائل نہیں ہوں جو اپنے آغاز میں لامتناہی ہیں اسیطرح |
| بحرکات لا تتناهی اولاً بل یصیرون | ان حرکات کا بھی قائل نہیں ہوں جو اپنے انجام میں لامتناہی |
| الی سکون دائم۔"[1] | ہیں بلکہ وہ دائمی سکون جمود کی حالت میں منتہی ہوجائیں گی |

یہ ابو الہذیل العلاف کا مذہب مشہور ہے، عامۂ متکلمین نے اس کا رد کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ حوادث کا

---

[1] الملل والنحل للشہرستانی جلد اول صفحہ ۲۳



اور حوادث مستقبلہ میں بنیادی فرق ہے، اور ایک کا قیاس دوسرے پر قیاس مع الفارق ہے، اس موضوع پر امام ابو الحسن الاشعری نے ایک کتاب تصنیف کی تھی جسکا نام ابن فورک نے "کتاب الرد فی الحرکات علی ابی الہذیل" بتایا ہے۔ لیکن مسٹر مکارتھی نے کتاب کو ایک قسم کا فلسفہ طبیعیات کا مسئلہ بنا دیا ہے

(۸۳) کتاب فی متشابہ القرآن: اس میں اشعری نے ملاحدہ اور معتزلہ کو ایک ہی زمرے میں شمار کرکے ان کا رد کیا ہے، اور ابن الراوندی کی کتاب التاج کا بھی رد ہے[2]، اصل میں ہے:

| | |
|---|---|
| وکتاب فی متشابه القرآن جمع | کتاب فی متشابہ القرآن اس میں امام صاحب نے |
| فیه بین المعتزلة والملحدین | معتزلہ اور ملحدین دونوں کو ایک گروہ محسوب |
| فیما یطعنون به فی متشابه الحدیث | کیا ہے کہ یہ دونوں احادیث متشابہات پر طعن کرتے تھے، |
| ونقض کتاب التاج علی ابن الراوندی[3] | اور نقض کتاب التاج ابن راوندی کے خلاف ہے |

اس میں دو باتیں قابل غور ہیں: (۱) مسٹر مکارتھی کے ترجمے سے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ "امام اشعری نے ملاحدہ اور معتزلہ کو ایک ہی زمرے میں کیوں شمار کیا ہے؟ لیکن تبیین کذب المفتری کی تصریح سے اس کی وجہ معلوم ہوجاتی ہے، کہ یہ دونوں گروہ احادیث متشابہات پر طعن کیا کرتے تھے، چنانچہ امام اشعری سے پہلے اور بعد میں بہت سے علمائے اسلام نے ان مطاعن کا جواب دیا ہے، امام اشعری سے پہلے ابن قتیبہ نے "تاویل مختلف الحدیث" اسی موضوع پر لکھی تھی، اور امام اشعری کے بعد امام ابن فورک نے "تاویل مشکل الحدیث" لکھی، بہرحال امام اشعری نے اپنی اس کتاب میں معتزلہ اور ملاحدہ کے ان مطاعن و اعتراضات کا جواب دیا ہے، جو وہ متشابہات قرآن و متشابہات حدیث پر وارد کیا کرتے تھے

۲۔ مسٹر مکارتھی نے لکھا ہے کہ اسی کتاب میں ابن الراوندی کی کتاب کا بھی رد ہے، حالانکہ یہ ایک مستقل کتاب ہے جس کا عنوان "نقض کتاب علی ابن الراوندی" ہے، اور کتاب متشابہ القرآن" میں جسکا

---

[1] تبیین ص ۱۳۵ سطر ۱۹ [2] معارف ص ۳۰۱ سطر ۱۰-۱۱ [3] تبیین ص ۱۳۵ سطر ۱۷-۱۳

موضوع متشابہات احادیث پر اعتراضات کا جواب ہے "کتاب التاج" کا انضمام بالکل نرالے جوڑ ہے،
کتاب التاج کا موضوع خود امام اشعری کے لفظوں میں قدم عالم کے عقیدے کی تائید ہے،

| | |
|---|---|
| کتاب التاج وھو الذی نصرفیہ القول بقدم العالم[1] | کتاب التاج اور وہ کتاب ہے جس میں (ابن الراوندی نے) عالم کے قدیم ہونے کے عقیدے کی حمایت کی ہے۔ |

لیکن اس سے ایک جانب امام اشعری کے علم کلام کی نوعیت کے بارہ میں غلط فہمی پیدا ہوتی ہے اور دوسری جانب ان کی کتابوں کی تعداد بھی کم ہو جاتی ہے، یہ دو کتابیں ہوتی ہیں، مگر مسٹر مکارتھی نے (۸۳) کے ضمن میں دونوں کو ایک محسوب کیا ہے،

(۹۸) ایک رسالہ عقائد پر، اس بارے میں کہ آیا "خلق" کا استعمال صحیح ہے[2]،

یہ ابہام انتہائی گمراہ کن ہے "عقائد" اور "خلق" کا استعمال" میں کیا تعلق ہے، پھر اس فقرے کا کہ "خلق کا استعمال صحیح ہے" کیا مفہوم ہے؟ کس کی شان میں؟ خالق کی شان میں یا مخلوق کی شان میں؟ اصل میں ہے،

| | |
|---|---|
| رسالۃ فی الایمان وھل یطلق علیہ اسم الخلق[3] | ایک رسالہ ایمان (اصطلاحی) کے باب میں کہ آیا اسے مخلوق کہا جا سکتا ہے یا نہیں (ایمان پر خلق کا اطلاق ہو سکتا ہے یا نہیں) |

یہ ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے کہ ایمان مخلوق ہے، یا غیر مخلوق، چنانچہ مشائخ حنفیہ میں بھی اس باب میں سخت اختلاف ہے، علمائے سمرقند اس کے مخلوق ہونے کے قائل ہیں اور علمائے بخارا غیر مخلوق ہونے کے، بلکہ مؤخر الذکر میں سے بعض علماء مثلاً ابن الفضل، شیخ اسمعیل بن الحسین الزاہد، اور ائمۂ فرغانہ نے تو اتنا مبالغہ کیا ہے کہ جو خلق ایمان کا قائل ہوا، اس کے کفر کا فتویٰ دیدیا اور اس پر کلام باری کے مخلوق ہونے کے قائل ہونے کا الزام لگایا، علامہ ابن الہمام الحنفی (المتوفی ۸۶۱ھ) "المسایرہ" میں لکھتے ہیں:

---

[1] تبیین ص ۱۲۹ سطر ۴ - د [2] معارف ص ۳۰۱ سطر ۹ ص ۳۰۲ سطر ۱ [3] تبیین ص ۱۳۴ سطر ۸ - ۹



| | |
|---|---|
| المسئلۃ الثانیۃ لمشائخ الحنفیۃ خلاف فی ان الایمان مخلوق او غیر مخلوق والاول عن اھل السمرقند والثانی من البخاریین بعد اتفاقھم علی ان افعال العباد کلھا مخلوقۃ للہ تعالیٰ وبالغ بعض مشائخ بخاری کابن الفضل والشیخ اسمعیل بن الحسین الزاھد وتبعھم ائمۃ فرغانۃ فکفروا من قال بخلق الایمان والزموا علیہ خلق کلام اللہ تعالیٰ[1] | دوسرا مسئلہ، مشائخ حنفیہ کا اس میں اختلاف ہے کہ ایمان مخلوق ہے یا غیر مخلوق، پہلا قول علمائے سمرقند سے اور دوسرا قول علمائے بخارا سے منقول ہے، بعد اس بات کے وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ بندوں کے تمام افعال اللہ تعالیٰ کے مخلوق کیے ہوئے ہیں اور بعض مشائخ بخارا مثلاً ابن الفضل اور شیخ اسمعیل بن الحسین الزاہد نے اس باب میں بہت زیادہ مبالغہ کیا ہے اور ائمہ فرغانہ نے اس میں ان کا اتباع کیا اور اس شخص کی تکفیر کی جو خلق ایمان کا قائل ہو، اور اس پر کلام باری کے مخلوق ہونے کے قائل ہونے کا الزام لگایا |

غالباً قیام بغداد کے زمانہ میں جب امام اشعری کو متعصب حنابلہ کا مقابلہ درپیش تھا مسئلہ "خلق ایمان" سے ان کو سابقہ پڑا کیونکہ ان کے مشہور دشمن الاہوازی نے جو گروہ حشویہ سے تعلق رکھتا تھا مسئلہ خلق ایمان کے باب میں امام اشعری کے موقف کو ان کے مطاعن کی فہرست میں محسوب کیا ہے، اور اس اعتراض کو نقل کرتے ہوئے حافظ ابن عساکر نے لکھا ہے:

| | |
|---|---|
| واما قولہ فی مسئلۃ الایمان فمن جنس ما تقدم فیہ فی البھتان | اور اہوازی نے مسئلہ ایمان کے بارہ میں جو کچھ امام اشعری کی جانب منسوب کیا ہے وہ اس کی پچھلی بہتان تراشیوں کے مانند ہے |

اس لیے اس مسئلہ خاص میں امام اشعری نے زیر بحث رسالہ لکھا تھا، یہ رسالہ آج ناپید ہے لیکن حافظ ابن عساکر نے اس کا تفصیلی مطالعہ کیا تھا، چنانچہ فرماتے ہیں:

---

[1] المسایرہ ص ۱۹۱

وقد وقفت على هذه المسئلة من تصنيف ابى الحسن فوجدت استدلاله فيما يدل على هذا التفصيل الحسن[1]

اللہ میں امام ابی الحسن کی تصنیف کے ذریعہ اس مسئلے سے واقف ہوا اور اس کتاب میں ان کے انداز استدلال کو اس پسندیدہ تفصیل پر دلالت کرنے والا پایا!

مسئلہ ایمان کے باب میں امام اشعری کا موقف بتصریح حافظ ابن عساکر حسب ذیل ہے،

وابو الحسن لا يقول بقدم الايمان على الاطلاق وانما يقول بقدم صفات العليم الخلاق فمن اسمائه التی سمى به نفسه "المؤمن" قال سبحانه (الملك القدوس السلام المؤمن المهيمن) فقيل انه مشتق من الايمان وقيل بل هو ماخوذ من الامان فمن قال انه اشتق من الايمان فلانه صدق نفسه فقال (ومن اصدق من الله قيلا) ومن قال انه ماخوذ من الامان فلانه امن اولياءه من ظلمه فلا يظلمهم فتيلا، فابو الحسن

امام ابو الحسن الاشعری علی الاطلاق ایمان کے قدیم ہونے کے قائل نہیں ہیں، بلکہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفات کے قدیم ہونے کے قائل ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ان اسماء میں سے جن سے اس نے اپنی ذات کو موسوم کیا ہے "المومن" بھی ہے، اللہ سبحانہ فرمایا ہے (الملک القدوس السلام المومن المہیمن) چنانچہ کہا گیا کہ (لفظ مومن) "ایمان" سے مشتق ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ ایمان سے نہیں بلکہ "امان" سے مشتق ہے، پس جو شخص یہ کہتا ہے کہ لفظ مومن "ایمان" سے مشتق ہے تو اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی تصدیق کی ہے (اسے سچا بتایا ہے) "ومن اصدق من اللہ قیلا" اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ وہ "ایمان" سے ماخوذ ہے تو اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دوستوں کو اپنے ظلم سے بےخوف بنا دیا ہے "فلا یظلمہم فتیلا" یعنی

---

[1] تبیین ابن عساکر



نفى الخلق عن الايمان الذى هو صفة من صفات الرحمن فاما الايمان الذى هو صفة الانسان محدثا وصفته قديمة وهل يتصور ذالك الا من مسخ بعد الانسانية بهيمية؟[1]

امام ابو الحسن الاشعری نے اس ایمان سے "خلق" کی نفی کی ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے، رہا وہ جو انسان کی صفت ہے تو اسکا قائل ہونا سراسر بہتان ہے اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ انسان تو حادث ہو اور اسکی صفت قدیم ہو، اور وہی شخص اس بات کا تصور کر سکتا ہے جسکی انسانیت مسخ ہو کر بہیمیت بن گئی ہو

غرض زیر بحث رسالہ کا موضوع یہ ہے کہ ایمان پر کس صورت میں مخلوق ہونے کا اور کس صورت میں غیر مخلوق ہونے کا اطلاق ہوتا ہے، مگر جناب مستشرق کی معراج تحقیق یہ ہے کہ "ایک رسالہ عقائد پر اس بارے میں کہ آیا خلق کا استعمال صحیح ہے"

یہ ہے مشتے نمونہ از خروارے مستشرقین یورپ کی تحقیق انیق!!

---

[1] تبیین ص ۳۹۳-۳۹۴

# ادبیات

## تاریخ وفاتِ حسرت آیاتِ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

از

مولانا حکیم سید مصلح الدین صاحب

کیف شراب و لذت شرب مدام رفت ساقی نماند و مطربِ نگین کلام رفت

آه و فغاں بگوشِ خواص و عوام رفت شورے است در زمانہ کہ عبدالسلام رفت

واحسرتا! مورخِ عالی مقام رفت افسوس! آں دبیر ادیب ہمام رفت

ضبط از جگر، قرار ز دل، دل زکام رفت از ما چوں نام نامیٔ عبدالسلام رفت

جلوہ شناس صبح و داداں شام رفت شب تیرہ گشت وحیف کہ ماہ تمام رفت

صد حیف نکتہ دان علوم سلف نماند واں کاتبِ حیاتِ صحابہ کرام رفت

آں یادگار حضرت شبلی کجاست حیف! دردا! ز دہر فنِ ادب را امام رفت

ثاقب زمامِ صبر و سکونم ز دست رفت

عبدالسلام آہ بدار السلام رفت

۱۳۷۶ھ

---



# مطبوعات جدیدہ

**اسلامی تہذیب اور اسکے اصول و مبادی** از مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، تقطیع اوسط ضخامت ۳۱۶ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ

پتہ: اسلامی مکتبہ نمبر ۳۴۷، بی کلاس معظم پورہ، حیدرآباد، دکن،

اس کتاب کے نام سے بظاہر دھوکا ہوتا ہے کہ عرف عام میں جس کو اسلامی تہذیب و معاشرت کہا جاتا ہے اس کے اصول و مبادی پر ہوگی، لیکن درحقیقت وہ اسلامی ایمانیات یا اسلامی تصور حیات پر ہے، مصنف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسلامی تہذیب اور اسلامی تصور حیات دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، بلکہ اسلامی تصور حیات ہی کا نام اسلامی تہذیب ہے جس کی بنیاد ایمانیات پر ہے، پھر اسی نقطۂ نظر سے اس کے اجزاء و عناصر یعنی دنیا میں انسان کی حیثیت، اس کے فرائض، زندگی کے متعلق اس کا نصب العین، دنیا و آخرت کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر، انسانی زندگی میں ایمان کی اہمیت، ایمان کا اسلامی مفہوم، اللہ، اس کے ملائکہ، اس کے رسولوں، اس کی کتابوں اور یوم آخرت پر ایمان کی ضرورت و اہمیت، اس کی حکمتوں اور مصلحتوں اور انسانی زندگی پر اس کے اثرات و نتائج پر بڑی مفصل بحث کی گئی ہے، اور ان مسائل کے متعلق اسلامی اور دوسرے مذاہب کی تعلیمات کا موازنہ کرکے انسانی فلاح کے نقطۂ نظر سے اسلامی تعلیمات کی برتری دکھائی گئی ہے، جس سے یہ پوری طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ کائنات کی تخلیق کا ایک خاص مقصد ہے، انسان اسی مقصد کے حصول کے لیے پیدا کیا گیا ہے، اور اسلام انسانی

زندگی کے متعلق ایک خاص تصور رکھتا ہے، جو بعض پہلوؤں میں دوسرے مذاہب سے اشتراک کے باوجود اپنی جامعیت و خصوصیات میں ان سب سے الگ و ممتاز ہے، اور حیات انسانی کے جملہ دنیاوی و اُخروی مسائل کا صحیح اور حکیمانہ حل اسی نے پیش کیا ہے، یہ اس کتاب کا اجمالی خاکہ ہے، اس کے تفصیلی مباحث کا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، مگر یہ مسائل اتنے عام ہیں کہ ان پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، سیرۃ النبیؐ خطبات مدراس اور اس قسم کی دوسری کتابوں میں جو سیرت اور اسلامی نظام پر لکھی گئی ہیں، یہ مباحث موجود ہیں، تاہم مصنف کی دوسری تحریروں کی طرح ان کی ذہانت، نکتہ وری اور متکلمانہ شان اس کتاب میں بھی موجود ہے؛

## گفتنی و ناگفتنی

از جناب شورش کاشمیری، تقطیع بڑی ضخامت ۲۷۲ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد: للعہ پتہ: مطبوعات چٹان نمبر ۸ میکلوڈ روڈ لاہور

یہ کتاب جناب شورش کاشمیری کے کلام کا مجموعہ ہے، اگر الاسماء تتنزل من السماء کا مقولہ صحیح ہے تو مصنف اس کے پورے مصداق ہیں، وہ محض تخلص اور نام کے نہیں بلکہ عمل اور کام کے بھی شورش ہیں، ان کی فطرت انقلابی ہے، ان کی طبیعت بے چین و بے قرار واقع ہوئی ہے، اسلیے ان کی پوری زندگی شورش اور دعوت انقلاب میں بسر ہوئی، ہندوستان و پاکستان کی آزادی سے پہلے وہ جنگ آزادی کے شعلوں سے کھیلتے رہے، اور آزادی کے بعد ملک و قوم کی اصلاح و ترقی کے لیے ان کا قلم خوں فشاں رہتا ہے، وہ تنہا صحافی نہیں بلکہ خطیب و شاعر بھی ہیں، اور اس لحاظ سے وہ اس دور کے ظفر علی خاں کہلانے کے مستحق ہیں، ان کی شاعری کا موضوع زیادہ تر سیاسی و سماجی مسائل، مقامی سیاسیات، وقتی واقعات و حوادث ہیں، ان کے متعلق ان کے جو خیالات اور جذبات پیدا ہوتے ہیں، ان کو وہ شعر کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں، مگر ان کا زور سخن اسی دائرے میں محدود نہیں ہے، بلکہ اس مجموعے میں اور بھی مختلف جذبات و تاثرات، نظمیں اور حسن و عشق کے ترانے بھی ہیں، ان کو شاعری پر پوری قدرت ہے، اس لیے جس موضوع پر لکھا ہے اس کا پورا حق ادا کیا ہے، اور پورا کلام شاعری کے ظاہری و معنوی محاسن سے آراستہ، الفاظ کے حسن کاری سے مرصع، خیالات کے اعتبار سے بلند، زندگی کی حرارت سے معمور، ملک و ملت کے لیے بانگ درا، نوجوانوں کے لیے دعوت انقلاب، سماجی مسائل کا نسخۂ اصلاح اور مواد فاسد کے لیے نشتر ہے، مگر خطابت ان کی فطرت میں ایسی رچی ہوئی ہے کہ کہیں کہیں شاعری پر غالب آگئی ہے، اور وہ گفتنی کے ساتھ ناگفتنی بھی کہہ گئے ہیں، کتاب کے شروع میں جناب تمہراور مصنف کے قلم سے شاعری کی حقیقت، اس کے قدیم طرز، جدید رجحانات، مصنف کی شاعری کی تاریخ، اس کے محرکات و خصوصیات، جدید شاعری، نئے شعرا اور اس مجموعہ کی نظموں وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔



## انتخاب صحاح ستہ

مرتبہ جناب مولانا محمد سعید صاحب، تقطیع بڑی ضخامت ۴۵۲ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد صہ پتہ: سعید اینڈ سنز مطبع سعیدی، قرآن محل، مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی۔

اردو میں احادیث نبوی کے متعدد مجموعے موجود ہیں، انتخاب صحاح ایک نیا مفید اضافہ ہے، اس میں صحاح ستہ سے آٹھ سو منتخب حدیثیں جمع کی گئی ہیں، یہ حدیثیں عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق اور دوسری دینی امور و مسائل سے متعلق ہیں، ہر حدیث کے متن کے ساتھ اسکا ترجمہ اور بعض بعض حدیثوں کے مفہوم و منشاء اور ان سے متفرع مسائل کی تشریح بھی کر دی گئی ہے، جو لوگ عربی سے ناواقف ہیں اور حدیث کی کتابوں کا براہ راست مطالعہ نہیں کر سکتے، ان کے لیے یہ منتخب مجموعہ بہت مفید ہے، آجکل حدیثوں کے خلاف جو بدگمانی پھیلائی جا رہی ہے، اس کے لیے بھی ایسی حدیثوں کے مجموعوں کو جن کا تعلق عملی زندگی سے ہو، مرتب کر کے دلنشین تشریح کیساتھ شائع کرنے کی ضرورت ہے، گو یہ مجموعہ اس معیار پر پورا نہیں اترتا، لیکن نفس مطالعہ حدیث اور

دینی امور و مسائل سے واقفیت کے لیے کارآمد اور مفید ہے،

**اقبال اور مُلّا** - مولفہ جناب منشی عبدالرحمن صاحب، تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۰ صفحات،

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، پتہ: گوشۂ ادب، چوک انارکلی، لاہور،

مذہبی پابندیوں سے آزادی کی وبا پاکستان میں برابر پھیلتی جاتی ہے، اور اس نے ایک مستقل تحریک کی شکل اختیار کرلی ہے، جس کے رہنما منکرین حدیث اور ان کے استاد اول مغرب زدہ طبقہ ہے، اور اس کے لیے "ملاازم" کی اصطلاح گڑھی گئی ہے، اور ایک مستقل "اینٹی ملا فرنٹ" قائم ہو گیا ہے، جس کا مقصد علمائے کرام کی تحقیر و تفضیح اور مذہب کی غلط تعبیر ہے، اور یہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ اس میں بعض ایسی ہستیاں بھی شامل ہیں جو کلام اقبال کی بہترین شارح سمجھی جاتی ہیں، چنانچہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے "اقبال اور ملا" کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے، جو ہماری نظر سے نہیں گذرا، لیکن "اقبال اور مُلّا" میں اس کے جو اقتباسات نقل کیے گئے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں ملا کے بارہ میں اقبال کے طنزیہ اشعار نقل کیے گئے ہیں، اور اس کے حاشیہ میں علمائے کرام کو ہر قسم کے الزاموں اور طعن و طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے، اور یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس قسم کے سخیف خیالات ڈاکٹر صاحب کے جیسے سنجیدہ شخص کے قلم سے نکل سکتے ہیں، مگر تجدد کا ذوق جو بھی کرائے کم ہے، اس بحث میں اقبال کو گھسیٹنا ان پر ظلم ہے، بلاشبہ انھوں نے ملا پر طنز کیا ہے مگر اس سے انکی مراد وہ جامد کٹھ ملا اور ملائے مکتبی ہیں جو فکر و نظر کی صلاحیتوں سے محروم ہیں، اہل علم و صاحب نظر علماء سے نہ صرف اقبال عقیدت رکھتے تھے بلکہ ان سے استفادہ کرتے تھے جس پر ان کے مکاتیب شاہد ہیں، پھر اگر انھوں نے ملا پر طنز کیا ہے تو اس سے کہیں زیادہ تحقیر آمیز خیالات مغرب زدوں کے متعلق ظاہر کیے ہیں، دینی امور میں وہ خود بڑے راسخ العقیدہ تھے جس پر انکا کلام اور انکی تحریریں شاہد ہیں، انکا تو مشن ہی مغرب زدگی اور مغربی تہذیب و تمدن کے خلاف جہاد اور مسلمانوں میں دینی روح پھونکنا تھا جس سے انکا پورا کلام معمور ہے، "اقبال اور مُلّا" میں اسی نقطۂ نظر سے اقبال اور ملا کے مندرجات اور منکرین حدیث کی خرافات کا مدلل جواب دیا گیا ہے،

"م"

جلد ۷۹ ماہ رجب المرجب ۱۳۷۶ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۵۷ء نمبر ۲

## مضامین